نگر نگر ای نظر

عامر بن علی

Nagar Nagar Ek Nazar

by

Amir Bin Ali

Published by

Nastalique Matbuat

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : نگر نگر اک نظر
مصنف : عامر بن علی
سرورق : Arina Zabrodina
University of Saint Petersburg-Russia
بارِاوّل : جون 2021ء
کمپوزنگ : عبدالستار
تعداد : 2000
مطبع : حاجی منیر پرنٹرز، لاہور
قیمت : -/500 روپے
بیرونِ ملک: -/50 امریکی ڈالر

نستعلیق مطبوعات: F-3 الفیر وز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0331-4489310
E-mail: *nastalique786@gmail.com*

انتساب

امی کی خوبصورت یادوں کے نام

حسنِ ترتیب

محبتوں کے سفیر کا سفرنامہ۔۔۔۔ اسداللہ غالب

حصہ اول

جہانِ تازہ

♍	تاراپا کا گاؤں	15
♍	احتجاج کے لاطینی طریقے	19
♍	نرودا کے دیس میں نیا سال	23
♍	لاتیرانا کا عُرس	26
♍	ہمبرسٹون	30
♍	قطر کا صحرائی گلاب	34
♍	سوویت انقلاب کے سو سال	38
♍	ویسٹ انڈیز میں کیا دیکھا	43
♍	بس ڈرائیور کے تین بچے	47
♍	دوبئی کی ایک جھلک	50
♍	متحدہ عرب امارات کا پاکستان سنٹر	54
♍	نیا امریکی صدر اور امن کی امیدیں	57

♍	صنفی برابری میں پاکستان کی حالت	61
♍	اس بلا سے نجات ممکن ہے	64
♍	کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں	67
♍	بھارت کا اقتصادی مستقبل اور پاکستان	70
♍	نگران حکمرانوں کا امتحان	74
♍	اساں دل نوں مرشد جان لیا	77
♍	کرونا وائرس کے عالمی پھیلاؤ کا آنکھوں دیکھا حال	80
♍	ابن عربی اور ارطغرل	84
♍	کرونا زدہ عید	88
♍	ملن کا موسم	91
♍	شہرِ سخن	94
♍	تعلیم کی اہمیت اور پاکستان	97
♍	میاں چنوں کا یادگار عالمی مشاعرہ	101
♍	مزاحمتی ادب اور تیز ہوا کا شہر	107
♍	ارژنگ کا ارتقاء	110
♍	سائیں، صاحب	114

حصہ دوم

ترابِ آفتاب کا منظر

♍	بازیچۂ سنگ و تذکرۂ جنگ	119
♍	خزاں کے رنگ	123
♍	شہزادی کی شادی	126

♍	موسم بدلا رت گدرائی	130
♍	ایٹمی بمباری اور سونامی کے بچوں پر اثرات	134
♍	والدین بے خبر ہیں	137
♍	صحافی خود خبر نہ بنیں	140
♍	جاپانیوں کی دیانت داری	143
♍	بیک پیکر صحافی	148
♍	صدر ٹرمپ کا دورہ جاپان	152
♍	جاپان روس سرحدی تنازعہ	156
♍	حلال نیل پالش	159
♍	تاج پوشی	163
♍	اک نئے عہد کا آغاز	166
♍	عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے	170
♍	مائی بیگ چیلنج	173
♍	ایٹمی بمباری کی یادیں اور خطرات	177
♍	یادگار تقریب رونمائی	180
♍	سالِ نو اور جاپان	184
♍	جاپان کا اردو بازار	187
♍	ڈرون سے اخبارات کی تقسیم	190
♍	وزارتِ تنہائی	194
♍	چین مخالف اتحاد	198
♍	محنت میں عظمت ہے	202

حصہ سوم

جو بچا ہے مقتلِ شہر میں

♍	منّو بھائی۔ وہ مرد قلندر چھوڑ گیا	206
♍	مشکور حسین یادؔ کی یادیں	210
♍	میجر منصور کی شہادت	214
♍	مشتاق احمد یوسفی کا عہد	218
♍	پاش پاش ہو کے بکھرا ہوا وہ لہو	222
♍	منیر نیازی کی بذلہ سنجی	226
♍	مظہر بخاری۔ شمع محفل تھا وہ شخص	231
♍	احمد ندیم قاسمی۔ تجھ سا کہاں سے لائیں	233
♍	شیشوں کا مسیحا رخصت ہوا	238

محبتوں کے سفیر کا سفر نامہ

عامر بن علی کا تعلق پاکستان کے قصبے میاں چنوں سے ہے۔اس کے خاندان کا کاروبار جاپان سے لے کر لاطینی امریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔یہ لوگ سیکنڈ ہینڈ گاڑیاں برآمد کرنے کے کاروبار سے منسلک ہیں۔عامر بن علی کا زیادہ وقت جاپان میں گزرتا ہے اور کبھی وہ لاطینی امریکہ کے ملکوں میں جا بستا ہے یہ اس کی کاروباری مجبوری ہے۔بچوں سے ملنے پاکستان آتے ہیں تو ملک بھر میں اپنے دوستوں سے ملاقاتیں بھی کرتے ہیں کوئی دو ماہ پہلے انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ رمضان المبارک میں پاکستان پہنچیں گے۔اور پھر لاہور کا چکر لگا کر مجھ سے ملنے آئیں گے۔میں نے بے تابی سے یہ دن انگلیوں پر گننا شروع کر دیئے۔عامر بن علی بھرپور جوانی کے دور سے گزر رہا ہے۔کاروبار کے سلسلہ میں وہ سمندروں کے اوپر سے سفر کرتا ہے۔اس لئے اس کے دل میں محبت کا سمندر موجزن رہتا ہے۔وہ ایک پر اعتماد نوجوان ہے مگر انتہائی شرمیلا شرمیلا سا۔اس کی شخصیت کا یہی پہلو میرے دل کو بھا گیا۔میری عامر بن علی سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ابھی طالب علم تھا۔اس لحاظ سے ہم فیلو اولڈ راوین بھی ہیں اور میں مجلّہ ''راوی'' کا ایڈیٹر بھی رہا ہوں۔زمانہ طالب علمی سے ہی عامر بن علی کو لکھنے کا بہت

شوق تھا۔اس کی پہلی دونوں کتابیں تو کالج یونیورسٹی کے زمانے میں ہی شائع ہوگئی تھیں۔گرچہ وہ سائنس کا طالب علم تھا اور پھر اس نے ایم۔بی۔اے کیا۔مگر تب بھی وہ کالج کے میگزین کا سب ایڈیٹر اور پھر ایڈیٹوریل بورڈ کا ممبر تھا۔نگرنگراک نظر اس کا تیسرا سفرنامہ ہے۔یہ سفرنامہ بھی قارئین کی امیدوں پر نہ صرف پورا اترے گا بلکہ پاکستانی ادب میں ایک بیش قیمت اضافے کا مؤجب بنے گا۔میں فرداً فرداً مضامین، کالمز اور فیچرز کی صورت میں تو اس منفرد انداز کے سفرنامے کے کئی حصے پڑھ چکا تھا،مگر پھر بھی مجھے مکمل مسودے کو پڑھنے کا اشتیاق تھا۔لاہور پہنچ کر اس نے مجھے فون کیا کہ وہ میری طرف آرہا ہے۔میں نے کہا کہ چلنے سے پہلے فون ضرور کرنا کہ میں عام طور پر مادرزاد لباس میں بستر پر لیٹا رہتا ہوں۔بہرحال یہ اس کی مہربانی ہے کہ اس نے میری فرمائش کے مطابق گھر سے نکلنے سے پہلے مجھے فون کر دیا کہ وہ فیروز پور روڈ پر ہے تو میں نے جلد از جلد انسانی لباس پہن لیا اور منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوگیا۔ہم دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ایک دوسری کا منہ تکنے لگے۔مجھے اس کی شکل نظر نہیں آرہی تھی اور اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میرے ذہن میں کیا خیالات پل رہے ہیں۔(غالبؔ صاحب ان دنوں ضعف چشم کے مرض میں مبتلا ہیں، اللہ کریم انہیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔۔ادارہ)ہم موسم پر گفتگو کر کے وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ٹوکیو کی سڑکوں پر کھلنے والے خوش رنگ پھولوں کی خوشبو کا ذکر بھی نہیں کر سکتے تھے۔لاطینی امریکہ کی ویرانی کا نوحہ بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک خاص موضوع پر بات کر لی جائے۔ان دنوں دنیا میں دو بحران للکار رہے ہیں۔فلسطین میں بچوں پر بم برسائے جا رہے ہیں اور کشمیر میں بچوں کو پیلیٹ گنوں سے اندھا کیا جا رہا ہے۔میں نے عامر بن علی پر ایک سیدھا سوال داغا، کیا وجہ ہے کہ فلسطین پر جن پاکستانی دانشوروں اور شاعروں نے کچھ لکھا ہے ان کا تعلق بائیں بازو سے ہے جنہیں ترقی پسند اور لبرل کہا جاتا ہے اور کشمیر کا رونا رونے والوں میں صرف دائیں بازو کے دانشور شاعر، سیاستدان اور مذہبی جماعتیں بھی شامل

ہیں؟ عامر بن علی نے گہرا سانس لیا اور کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلسطین اور کشمیر دونوں جگہیں آزادی کی تحریکیں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں۔لیکن ان دونوں کے ڈی این اے میں بہت نمایاں فرق ہے۔فلسطین کی تحریک آزادی لبرل اور سیکولر قسم کی ہے اس میں جارج حباش جیسا مسیحی بھی شامل ہے ۔جبکہ کشمیر میں سراسر مذہبی بنیادوں پر تحریک چل رہی ہے۔میں نے پوچھا یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟ عامر بن علی نے کہا کہ فلسطین کی تحریک آزادی میں ابتدائی طور پر صرف مسلمان شامل نہیں تھے بلکہ یہودی اور عیسائی بھی اس میں سرگرم عمل تھے۔جب لیلیٰ خالد نے پہلا بڑا دھماکہ کیا تو اس کے دوسرے ساتھیوں میں کچھ مسلمان تھے۔کچھ یہودی اور کچھ عیسائی اور یہ سب لوگ ایک انقلابی ہیرو چے گویرا سے متاثر تھے۔انہوں نے مزید کہا کہ فلسطینی شاعر محمود درویش کی نظموں کے ترجمے پاکستان میں منو بھائی نے کئے جو ترقی پسند رجحانات کے مالک ہیں۔اسی طرح تحریک فلسطین کے حامیوں نے بیروت سے ایک رسالہ نکالا تو اس کے انگریزی حصے ''لوٹس'' کی ادارت کے فرائض فیض احمد فیض جیسے ترقی پسند شاعر نے ادا کئے۔جہاں تک بیت المقدس کا تعلق ہے قبلہ اول کی حیثیت سے تمام مسلمانوں کے لئے اس کی اہمیت مسلمہ امر ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلم دنیا کے شاعروں اور دانشوروں نے تحریک فلسطین پر بہت کم قلم اٹھایا ہے۔یوں کشمیر اور فلسطین کے مسئلے پر مسلم عوام دو حصوں میں تقسیم ہے اور اسرائیل اور بھارت اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مظالم میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔

عامر بن علی کی گفتگو کو روکنا میرے لئے مشکل ہو رہا تھا۔وہ ایک حساس دل کا مالک ہے اور دس کتابوں کا مصنف ہے جن میں چار شعری مجموعے، کچھ سفرنامے اور کچھ انٹرویوز اور کچھ لاطینی امریکہ کے شاعروں کے تراجم شامل ہیں۔وہ نگر نگر گھوم چکا ہے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہے۔اس کی سوچ کسی خاص دائرے تک محدود نہیں۔اس کی نظریں فضائے بسیط پر جمی ہوئی ہیں۔وہ دنیا کو اوپر سے دیکھتا ہے۔جبکہ میرے جیسے لوگ گرداب میں پھنسے ہوئے کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہ گئے۔عامر بن

علی کے پاس وقت محدود تھا۔اور ہم لامحدود مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔بلآخر اس نے رخصت چاہی۔ خوشبو، محبت، چاشنی اور چاہت کا پیکر مجھے ڈرائنگ روم میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔عامر بن علی کی چند کتابوں کے ٹائیٹل میرے کمرے میں خوشبو بکھیر رہے تھے۔محبت کے موسم، چلو اقرار کرتے ہیں، محبت چھو گئی دل کو، یاد نہ آئے کوئی، سرگوشیاں، آج کا جاپان، جہاں گردی، گفتگو، محبت کے دو رنگ، مکتوب جاپان، گردسفر، نگرنگراک نظر ان کتابوں میں ایک نیا اضافہ ہے جو شائع ہونے جا رہی ہیں۔ان کتابوں سے عامر بن علی کی مہک اٹھتی رہے گی۔عامر بن علی میرے گھر سے گئے ہیں۔مگر دل میں سمائے ہوئے ہیں۔ان کا نیا سفرنامہ ''نگرنگراک نظر'' بہت ہی دلچسپ واقعات پر مبنی اور طرزِ تحریر انتہائی سہل اور خوبصورت ہے، قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ مصنف کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے۔کہیں ادبی چاشنی تو کہیں صحافتی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ثقہ ادیب اور معتبر صحافی ہونے کے سبب زبان و بیان پر انہیں دسترس ہے مگر لکھنے کا انداز عام فہم اور سادہ ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو وہ اپنی بات سمجھا سکیں۔یہ سفرنامہ تحریر کر کے عامر بن علی نے پاکستان کی بلاشبہ خدمت کی ہے۔جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں اور اس کتاب کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔ایسی فقید المثال تخلیقی کاوش پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اسداللہ غالب

لاہور

جون ۲۰۲۱

حصّہ اول

جہانِ تازہ

تاراپا کا گاؤں

بڑھیا بڑے تحمل سے پرسکون لہجے میں بات کررہی تھی۔ پانچ صدیاں پہلے ہسپانوی فاتحین کے ہاتھوں بسنے والے اس گاؤں میں رہنے کے لیے ذریعہ آمدن ہونا ضروری ہے۔ آمدنی کا یہ ذریعہ مستقل ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس دورافتادہ گاؤں میں تو کوئی کاروباری مواقع موجود نہیں ہیں۔ اپنے بڈھے شوہر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی، جیسے ہم دونوں کا مستقل ذریعہ آمدن موجود ہے۔ ہمیں سرکار کی طرف سے پینشن آتی ہے۔ مہربان بزرگ خاتون نے تاراپا کا کے ساتھ اپنی وابستگی کے بارے میں بتایا کہ یہاں زندگی بہت پرسکون ہے۔ میرے سوال کے جواب میں شوخی سے کہنے لگی کہ میں تو جدی پشتی شہری ہوں، میرا یہ محبوب مگر پینڈو ہے۔ اسی کی محبت میں نصف صدی پیشتر اس نخلستان میں آ کر بس گئی، اور پھر یہیں کی ہو کر رہ گئی۔ یہ بتاتے ہوئے بڑھیا نے پیار سے اپنے شو ہر کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

لق و دق صحرا کے بیچ اس نخلستان میں دوسو کے قریب گھر ہوں گے۔ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیں تو تین سو مکانات یقیناً نہیں ہوں گے۔ چلی کا مجموعی رقبہ پاکستان سے ملتا جلتا ہے۔ جغرافیائی تقسیم اس پٹی نما ملک کی یوں کی گئی ہے کہ اس پٹی کو 13 ریجن یا انتظامی یونٹ بنا کر الگ الگ شنا خت دی گئی ہے۔ چلی کا پہلا ریجن اسی ہسپانوی طرز تعمیر کے شاہکار چھوٹے سے گاؤں کی نسبت سے ''تاراپاکا'' کہلاتا ہے۔ سینکڑوں مربع میل رقبے پر پھیلے ملک کے شمال میں واقع اس خطے کی سرحدیں پیرو اور بولیویا کے ساتھ ملتی ہیں۔ ملک کی اہم ترین بندرگاہیں اس خطے میں پائی جاتی ہیں

۔دو بڑے شہر اریکا اور اقیقی اس ریجن میں پائے جاتے ہیں، جن میں پاکستانیوں کی قابل ذکر تعداد موجود ہے، سبھی کاروباری لوگ ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ''تاراپاکا'' ٹیکس فری زون ہے۔مرکز سے دوری کے سبب اس علاقے کو خصوصی رعائیت دی گئی ہے۔ٹیکس فری زون ہونے کے سبب یہا ں کثیر تعداد میں غیر ملکی آباد ہیں جو تقریباً سبھی کاروباری لوگ ہیں۔پاکستانی زیادہ تر گاڑیوں کے کا روبار سے متعلق ہیں، مسلمان تو یہاں ترک، ایرانی اور عرب بھی ہیں مگر یہ سعادت پاکستانیوں کو نصیب ہوئی کہ انہوں نے یہاں پر شکوہ مساجد تعمیر کی ہیں جو کہ سبھی آباد ہیں۔

بڑے بڑے ملکوں کے بڑے بڑے شہروں کی بڑی بڑی باتیں تو آپ سنتے اور پڑھتے ہی رہتے ہیں۔مگر لاطینی امریکہ کے چلی میں ہسپانوی نوآبادیاتی عہد کا یہ گاؤں آپ کو شاید انٹرنیٹ پر بھی نہیں ملے گا، چونکہ یہ بستی بہت ہی دور افتادہ اور تنہا ہے، تاراپاکا جیسے مقامات دریافت کرنا مجھے بے حد پسند ہے، جہاں تک رسائی مشکل ہو اور کم کم سیاح ہی اس طرف کا رخ کرتے ہوں ۔نخلستان میں بسے اس گاؤں جانے کے لیے مجھے دو چیزوں نے متحرک کیا، ان میں پہلی تو طرز تعمیر اور آثار قدیمہ تھے۔یہ گاؤں چونکہ سپین سے آئے عیسائی مبلغین اور فاتحین نے بسایا تھا اس لیے قدیم ہسپانوی طرز تعمیر یہاں بے حد نمایاں ہے۔سیلاب زدہ قدیم آثار کے علاوہ کہنہ کلیسا جو کہ عیسا ئی صوفی بزرگ سینٹ لورانسو کے نام سے منسوب ہے، پوری شان کے ساتھ کئی صدیوں سے ایستا دہ ہے۔دوسری وجہ جس نے اس سفر کی ترغیب دی وہ یہاں کا پانچ صدیاں پرانا قبرستان ہے۔ پرانے کتبے، تعویز قبر اور لوح مزار بہت ساری کہانیاں بیان کرتے ہیں۔

اس گاؤں کی کوئی خاص معیشت نہیں ہے مگر ہریالی کے سبب کچھ لوگ یہاں مویشی پال لیتے ہیں اور پھر پروان چڑھا کر انہیں فروخت کر کے کچھ منافع کما لیتے ہیں آمدن کا دوسرا ذریعہ عیسائی بزرگ سان لورانسو کی درگاہ سے وابستہ چھوٹے، بڑے ٹھیلے، چھابے، ڈھابے ہیں، جو کیتھولک عقیدے کے بزرگ کے کلیسا پر حاضری کے لیے آنے والے زائرین کو روزمرہ کی بنیادی ضروری اشیاء اور سامان خورد و نوش فروخت کرتے ہیں۔البتہ سالانہ مذہبی تقریبات یا برسی کے موقع پر صور ت حال چند دن کے لیے یکسر بدل جاتی ہے۔جنگل میں منگل کا مقولہ یہاں بالکل صادق آتا ہے ۔گزشتہ برسوں میں سالانہ میلے کے موقع پر تقریبا ایک لاکھ معتقدین ملک کے طول و عرض سے اس

مزار پر حاضری دینے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ گاؤں کے مقامی لوگوں کی چاندی ہو جاتی ہے کہ وہ فائیو سٹار ہوٹل کے نرخوں پر مہمانوں کو اپنے گھروں میں ٹھہراتے ہیں۔ کچھ احباب نے فقط سالانہ میلے کے دنوں کے لیے یہاں مکان خرید چھوڑے ہیں۔ جو باقی تمام سال خالی رہتے ہیں۔ میلے کے دوران مذہبی مناجات ہوتی ہیں۔ روحانی موسیقی بجائی جاتی ہے اور صوفی رقص پیش کیا جاتا ہے

۔

تاراپا کا گاؤں میں داخل ہوتے ہی آثار قدیمہ نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ نیم منہدم مکان، سرائے، کہنہ بازار، مگر خوبصورتی یہ ہے کہ اس سارے منظر کا رنگ، ڈھنگ بالکل ہسپانوی ہے، لگتا ہے میڈرڈ یا قرطبہ کے کسی نواحی گاؤں میں آنکلے ہیں۔ چلی کے ہزاروں کلومیٹر پر پھیلے شمالی علاقہ جات کا یہ سب سے زرخیز قطعہ اراضی کہلاتا ہے، گرچہ اس کا رقبہ انتہائی مختصر ہے۔ یہاں پہنچ کر پہلا خیال تو یہ آیا کہ آج سے پانچ سو سال پہلے ہسپانوی فوجی یہاں پہنچے کیسے؟ اس وقت تو ہوائی جہاز اور موٹر گاڑیاں نہیں ہوتی تھیں۔ منطقی سی بات لگتی ہے کہ بحری جہازوں سے آئے تھے۔ پھر ذہن میں خیال آیا کہ قریب ترین بندرگاہ بھی یہاں سے سو میل دور ہے۔ بھلا ہسپانوی اس بیابان میں لینے کیا آئے تھے؟ بہت سارے انسانی ارتقاء کے متعلق ایسے سوالات کے جوابات ایسی جگہوں پر جا کر ملتے ہیں۔ یہاں انسانی بستی بسنے کی وجہ تو صحرا میں سبزے کا واحد ٹکڑا ہونا سمجھ میں آجاتا ہے، اس گلستان میں آکر مگر یہ بھی گرہ کھلتی ہے کہ ماضی میں انسانوں کی زندگی کتنی سادہ اور ضرورتیں کتنی محدود ہوتی تھیں۔ فقط کھانا اور پانی، یہ دو چیزیں جہاں میسر آجاتیں تو لوگ خوشی خوشی اس جگہ آباد ہو جایا کرتے تھے۔

گاؤں کے وسط میں گرجا گھر کے اردگرد بہت رونق تھی۔ اس رونق کا سبب سیاح نہیں تھے۔ بلکہ دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے سینٹ لورانسو کے عقیدت مند حضرات وخواتین تھیں۔ چرچ میں لمبی قطاروں میں لوگ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ زیادہ تر ان میں بیمار و نادار لوگ ہی تھے جو اپنی صحتیابی و شفا پانے کے لیے حاضری بھرنے آئے تھے۔ کلیسا کے باہر لنگر تقسیم ہو رہا تھا۔ یہاں پر بھی لمبی قطاریں تھیں مگر دھکم پیل بالکل نہیں تھی۔ نیاز میں مچھلی سے تیار کردہ ''سیچے'' تقسیم ہو رہے تھے۔ یہ پیرو کا قومی کھانا بھی ہے۔ کچی مچھلی کو تازہ لیموں کے رس میں لمبا عرصہ بھگونے کے بعد اس میں پیاز کی قاشیں اور دھنیا ڈال کر تیار کیا جاتا ہے۔ سچ پوچھیں تو یہ انتہائی لذیز کھانا ہے۔

قدیم عمارتوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔اس لیے بھی کہ گھروں کے لکڑی کے دروازے بالکل اسی ڈیزائن کے ہیں جیسے ہمارے گھروں میں آج بھی چوبی دروازے استعمال ہوتے ہیں ۔ایک اور خوبصورت پہلو جس کا ذکر اس گاؤں کے طرز تعمیر کے تذکرے میں ضروری ہے، وہ عمارتوں کے محراب ہیں۔گھروں کے برآمدوں میں بھی لکڑی کے محراب بنائے گئے ہیں۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کا ڈیزائن بالکل وہی ہے جو اسلامی آرٹ یا عرب فن تعمیر کا خاصہ ہے۔یہ قابل فہم بات ہے کہ عربوں نے اسپین پر آٹھ سو سال حکومت کی تھی،جس کا ایک پرتو اور پہلو یہ عمارتی محراب ہیں جو ہسپانیہ اپنے فاتحین جنگجوؤں کے ساتھ یہاں لے آیا تھا۔گاؤں کے مرکز میں کلیسا کا مینار بھی عرب فن تعمیر کا حصہ لگتا ہے۔اس کلیسا کا ایک حصہ عبادت اور دعائیہ اجتماع کے لیے مخصوص ہے، جبکہ دوسرا حصہ میوزیم محسوس ہوتا ہے۔

سان لورانسو سے منسوب اس انتہائی سادہ اور کشادہ چرچ کے میوزیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے آخری عشائیے کا منظر پتھر سے بنے مجسموں سے مجسم کیا گیا ہے۔یسوع مسیحؑ کے مصلوب ہونے سے بیشتر رات، کھانے کی میز پر، اپنے اصحاب کے ساتھ گفتگو کا منظر، تصویری شکل میں تو بارہا اور بہت ساری پینٹنگز میں یقیناً قارئین بھی ملاحظہ فرما چکے ہوں گے، مگر مجسم شکل میں، ان تمام اصحابِ مسیحؑ کے نام کے ساتھ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا۔جس بزرگ کے نام اور دم قدم سے اس کہنہ گاؤں کی رونق ہے وہ سان لورانسو بھی تبلیغ کی غرض سے اسپین سے ہی آئے تھے۔ تاراپا کا گاؤں لاطینی امریکہ میں ہسپانوی نوآبادیاتی عہد کی ایک جیتی جاگتی یادگار تصویر ہے۔

احتجاج کے لاطینی طریقے

احتجاج کرنا کسی بھی ملک کے عوام کا بنیادی انسانی حق ہوتا ہے۔احتجاج کرنے کے طریقے مگر ہر ملک و قوم کے الگ الگ ہیں۔بعض اوقات یہ ملتے جلتے ہوتے ہیں اور اکثر یکسر منفرد نظر آتے ہیں۔حرف شکایت بلند کرنے کا طریقہ تاریخ اور ثقافت سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔ایشیاء و افریقہ کے علاوہ مغربی اقوام میں مروجہ احتجاجی طریقوں سے تو ہم بڑی حد تک شناسا ہیں مگر لاطینی امریکہ کے ممالک ہماری نظروں سے عمومی طور پر اوجھل ہی رہتے ہیں۔اس کی وجہ دور افتادہ اور تنہا ہونے کے علاوہ وہاں کی لاطینی زبان سے اخذ کردہ ہسپانوی اور پرتگیزی زبانیں بھی ہیں۔جو کہ ہمارے ملک کی غالب اکثریت کے لئے اجنبی ہیں۔گزشتہ ایک ماہ سے میں لاطینی امریکہ کے سفر پر ہوں اور یہ یہاں احتجاج کا موسم ہے۔ہر تیسرے ملک میں احتجاجی تحریک چل رہی ہے۔کہیں دائیں بازو تو کہیں بائیں بازو کے لوگ احتجاج کر رہے ہیں،کئی جگہ اس نظریاتی تقسیم سے ماورا لوگ اپنے مطالبات کے حق میں نعرہ ءمستانہ بلند کر رہے ہیں۔اس بحث میں جائے بغیر کہ مذکورہ مظاہرے اور مظاہرین کے مطالبے جائز ہیں یا ناجائز،میں نے سوچا کہ آپ کو ان احتجاج کرنے والوں کے طریقۂ احتجاج سے متعارف کروایا جائے۔

سب سے موثر اور فوری متوجہ کرنے والا طریقہ تو باورچی خانے میں استعمال ہونے والے دھات سے بنے ہوئے برتن پیٹنا ہے۔آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اگر شہر کے کسی بھی چوک میں سو یا دو سو افراد بھی ہاتھوں میں اسٹیل کے چمچ اور فرائی پین یا دیگچی پیٹنا شروع کر دیں تو کس قسم کا

ماحول پیدا ہوجاتا ہوگا۔اس کے صوتی اثرات ایسے ہوتے ہیں کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔باورچی خانے کے خالی دھاتی برتن پیٹنے کا مقصد صرف شور برپا کرنا نہیں ہوتا، بلکہ یہ پیغام دینا ہوتا ہے کہ گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے، یہ بھوک اور پیاس کا استعارہ بن جاتے ہیں، یہ خالی برتن جب مظاہرین انہیں پیٹتے ،بجاتے گلیوں، بازاروں میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔عموماً سال نو مسیحی دنیا میں خوشی کا موقع ہوتا ہے۔چراغاں اور آتش بازی کے علاوہ رات کے عین بارہ بجے خوشی کے نعرے گونجتے ہیں۔اس برس کے آغاز پر میں چلی میں تھا، جیسے ہی رات کے بارہ بجے پورے ملک میں لوگوں نے گھریلو برتن پیٹنا شروع کر دیے۔میرے بہت سارے دوستوں کو یہ آواز بہت ناگوار گزری مگر بہرحال یہ احتجاج کا ایک طریقہ ہے۔

سلوسائیکلنگ کے مقابلے پاکستان میں اکثر کالجز میں ہوتے ہیں۔اس میں مقابلہ سست رفتاری کا ہوتا ہے۔یعنی اس دوڑ کا فاتح وہ ہوتا ہے جو سب سے آہستہ رفتار سے سائیکل چلاتا ہے۔سائیکل سے گرے بغیر اس ریس میں آخر پر پہنچنے والا پہلی پوزیشن پاتا ہے۔اس تفصیل کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ لاطینی امریکہ میں احتجاج کا یہ مقبول طریقہ ہے کہ مظاہرین شہر کی مصروف ترین شاہراہوں کے عین درمیان میں بیس تیس یا اس سے زیادہ کی تعداد میں سائیکل پر سوار ہوکر آجاتے ہیں، منہ میں ریفری والی سیٹی دبا کر بجاتے جاتے ہیں اور سلوسائیکلنگ کرتے ہیں۔اب بظاہر وہ کوئی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر رہے ہیں، سڑک پر سائیکل چلانا بھی ان کا حق ہے ،مگر رفتار اور انداز ایسا ہے کہ گاڑیوں کی میلوں لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں۔مکمل ٹریفک جام ہوجاتا ہے اور مظاہرین سائیکلوں پر سیٹی بجاتے چیونٹی جیسی رفتار سے چلتے جاتے ہیں اور اپنا احتجاج نوٹ کرواتے جاتے ہیں۔

ٹائر جلانا اور جلاؤ، گھیراؤ کے دیگر طریقے تو پورے عالم میں یکساں ہیں، لاطینی امریکہ کی انفرادیت یہ ہے کہ یہاں پر احتجاج کا دن پرانے فرنیچر سے نجات حاصل کرنے کا موقع بھی ہوتا ہے۔ضرورت سے زیادہ اور پرانا فرنیچر لوگ گھروں سے لے کر آتے ہیں اور عین چوراہے میں لاکر لکڑی کو آگ دکھا دیتے ہیں۔کئی نٹ کھٹ مظاہرین ٹریفک روک کر تیز میوزک چلا کر رقص شروع کر دیتے ہیں۔بات یہاں تک ہی ہو تو پھر بھی گوارا ہے۔نامراد ٹریفک میں پھنسے ہوئے

لوگوں کو بھی مجبور کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر رقص کریں۔خلاف ورزی کی صورت میں چونکہ گاڑی کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دی جاتی ہے،اس لئے مظاہرین کے ساتھ متاثرین بھی موسیقی کی بلند لے اور تان پر رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

کاروباری اداروں،فیکٹری،کارخانوں اور مل مزدوروں کا احتجاج کا عمومی طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے کارخانے کے مرکزی گیٹ کے سامنے تمام مزدور دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں۔اگر اپنے مالک کو مزید ذلیل کرنا مقصود ہو تو مزدور آتے جاتے راہگیروں سے چندہ مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔خاموش احتجاج کا عمومی طور پر یہی طریقہ رائج ہے۔چندے سے جمع رقم کا کھانا منگوایا جاتا ہے یا پھر ام الخبائث کا بندوبست ہوتا ہے۔ہمارے ایک پاکستانی دوست جن کی پیرو میں ہمارے شوروم کے قریب ورکشاپ تھی،ان کے بارے میں مشہور تھا کہ اپنے ملازمین کو تنخواہ دینا گناہ کبیرہ خیال کرتے ہیں۔ایک بار میں نے بھی ان سے کہا کہ آئے دن آپ کے مرکزی گیٹ کے سامنے مزدور،مستری کام بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں،ان کے بار بار احتجاج کے باوجود آپ بروقت تنخواہ کی ادائیگی کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ آپ کے کاروباری حالات بھی برے نہیں ہیں۔لاطینی امریکہ میں مقیم ہمارے اس دوست کا موقف تھا کہ اگر دو،چار مہینے کی تنخواہ دبا کر رکھی جائے تو ملازم کام چھوڑ کر بھاگتا نہیں ہے۔جب تک میں پیرو میں مقیم رہا،ان کے گیٹ کے سامنے اکثر ہی احتجاج کا منظر دیکھا۔ان کے ایک ملازم کا کہنا تھا کہ کتے کے منہ سے ہڈی چھیننا اور آپ کے دوست سے تنخواہ وصول کرنا ایک جیسا مشکل کام ہے۔

وال چاکنگ پوری دنیا میں اپنے مطالبات اور شکایات کے اظہار کے لئے استعمال ہوتی آئی ہے۔پاکستان میں عموماً یہ کام پروفیشنل پینٹرز،برش،سفیدی اور سیاہی کی مدد سے خوش خطی کے ساتھ انجام دیتے ہیں،جس کا وہ محنتانہ وصول کرتے ہیں۔وال چاکنگ میں ایک نئی جہت کا اضافہ ''گریفٹی'' نے کیا ہے۔سپرے پینٹ کی ایجاد سے دنیا بھر میں وسیلۂ روزگار کے طور ہر دیواریں لکھنے والوں کا کام ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔اب کوئی بھی آدمی بازار سے سپرے پینٹ کی سرخ یا سیاہ بوتل لے کر آتا ہے اور اپنی پسند کی دیوار پر اپنی من پسند تحریر لکھ دیتا ہے،کہیں تصویر بنا دیتا ہے۔اس وقت لاطینی امریکہ کے آپ کسی بھی ملک میں جائیں آپ کو دیواریں

''گریفٹی'' سے اٹی ہوئی ملیں گی۔ کہیں کہیں حیرت بھی ہوتی ہے، ملالہ یوسف زئی کی میکسیکو شہر کی ایک دیوار پر بنی تصویر دیکھی تو پہلی نظر میں آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ کلیسا کی ایک دیوار پر کسی منچلے نے سوالیہ انداز میں سیاسی وسماجی صورتحال کے پیشِ نظر لکھ دیا تھا کہ اس بارے میں کلیسا کیا کہتا ہے؟ کسی اور نے شرارت سے نیچے لکھ ڈالا کہ اس بارے میں کلیسا خاموش ہے۔

بلیک اینڈ وائٹ پوسٹرز کی ایک قطار کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ ہمارے الیکشن کمیشن سے منظور شدہ سائز کے پوسٹرز پر پیلٹ گن کا شکار مظاہرین کے چہروں کی تصاویر تھیں اور متاثرہ آنکھ کے اوپر سرخ رنگ کا ضرب کا نشان۔ ایک پوسٹر پر صرف ایک شخص کی تصویر، اس کا مکمل نام اور پیشہ جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اگر کسی متاثرہ فرد کی دونوں آنکھوں کو پیلٹ گن کی گولی سے نقصان پہنچا تھا تو پھر دونوں آنکھوں پر اس بلیک اینڈ وائٹ اشتہار میں سرخ رنگ کا نمایاں ضرب کا نشان لگایا گیا تھا۔ چلی کے دارالحکومت سنتیا گو کے مرکزی بازار میں پیلٹ گن کا شکار افراد کے چہروں کے نشان زدہ پوسٹروں کی قطار دیکھ کر مجھے مقبوضہ کشمیر کی یاد آ گئی۔ بھارت کے زیرِ تسلط کشمیر میں ہزاروں کی تعداد میں بے گناہ کشمیری بھارتی فوج کی پیلٹ گنوں کا شکار ہو کر اپنی بینائی جزوی یا پھر مکمل طور پر کھو چکے ہیں۔ میرے خیال میں پاکستانی پارلیمنٹ کی کشمیر کمیٹی اگر کوشش کرے تو پیلٹ گنوں سے متاثرہ افراد کی تصاویر اور کوائف حاصل کر کے اسے پوری دنیا کے سامنے مشتہر کر سکتی ہے۔ یہ چھوٹی سی کاوش ہو سکتا ہے مظلوم کشمیری افراد کا کرب عالمی سطح پر اجاگر کر کے بھارتی فوج کی بربریت بے نقاب کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔

نرودا کے دیس میں نیا سال

عالمی سطح پر عوامی تحریکوں کا ایک بالکل نیا پہلو سامنے آیا ہے، ان احتجاجی تحریکوں کی قیادت کوئی سیاسی جماعت نہیں کر رہی ہے۔ جیسا کہ پڑوسی ملک ہندوستان میں جاری احتجاج ملک کے کونے کونے میں پھیل چکا ہے، جس کی بنیاد غیر ملکی شہریوں کو بھارتی شہریت دینے کا نیا قانون ہے۔ مودی سرکار کے اس نئے قانون کے مطابق اگر آپ مسلمان ہیں تو پھر آپ کو انسانی ہمدردی کے تحت ہندوستان شہریت نہیں دے گا۔ جبکہ بصورت دیگر بھارتی حکومت کی انسانی دوستی بیدار ہوگی اور آپ کو شہریت سے نواز دیا جائے گا۔ گر چہ اس کالے قانون کے خلاف اپوزیشن کی تمام سیاسی جماعتیں بھی سراپا احتجاج ہیں مگر عوامی احتجاج کسی بھی سیاسی پارٹی کے کنٹرول میں نہیں ہے، وہ لوگ بھی احتجاج کا حصہ ہیں جو کسی سیاسی پس منظر اور نظریے کے حامی نہیں ہیں۔ حیرت انگیز طور پر عوامی ردعمل اور احتجاج کا یہی طریقہ اس وقت کئی مما لک میں جاری ہے۔ اس کی ایک مثال لاطینی امریکہ کے ملک چلی سے اٹھنے والی مقبول عوامی احتجاج کی تحریک بھی ہے، جہاں میں اس وقت قیام پذیر ہوں۔

گزشتہ تین ماہ سے جاری اس عوامی احتجاج میں اب تک سو کے قریب افراد ہلاک ہو چکے ہیں، زخمیوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہے جبکہ دس ہزار کے قریب تعداد میں مظاہرین جیل بھیج دیئے گئے ہیں۔ ریل کے کرایوں میں اضافے کے خلاف شروع ہونے والی اس عوامی تحریک کی ابتداء کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ نے کی تھی۔ دارالحکومت سنتیاگو کے زیر زمین بیشتر ریلوے اسٹیشن

نذرِ آتش کر دیے گئے۔حکومت نے مظاہرین کو دبانے کے لیے پولیس کا استعمال کیا۔جس سے احتجاج مزید پھیل گیا۔طلباء کے بعد دیگر شعبہ ہائے زندگی کے لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے۔بیکاری، مہنگائی اور معاشی تفاوت کے خلاف ملک کے تمام شہروں میں لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ان مظاہرین کی تعداد لاکھوں میں پہنچ گئی۔عوامی احتجاجی تحریک کے مطالبات میں کم از کم تنخواہ کی سطح میں اضافہ،صحت اور تعلیم کی بہتر اور سستی سہولیات ،پنشن کے نظام میں بہتری کے علاوہ نیا آئین اور صدر مملکت کا استعفیٰ بھی شامل ہے۔موجودہ صدر پنیرا نے ایمرجنسی کا نفاذ کر کے حالات کو قابو کرنے کی کوشش کی ہے۔جگہ جگہ فوج طلب کی گئی ہے اور رات کا کرفیو ملک کے بیشتر شہروں میں نافذ کیا گیا۔کئی وزراء کے قلمدان تبدیل کئے گئے۔وزیر داخلہ اور خزانہ بھی بدل کر دیکھے گئے ہیں۔حالات پر نظر رکھنے والے احباب متفق ہیں اس بات پر کہ سوشلسٹ صدر آلندے کا تختہ الٹنے اور جنرل پنوشے کی فوج کشی کے ہنگام ایسی صورتحال ضرور تھی مگر اس کے بعد کبھی حالات اتنے خراب نہیں ہوئے ، جتنے اب ہو گئے ہیں۔دارلحکومت سے لے کر چھوٹے چھوٹے شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔شہروں کا منظر واضح طور پر بدل چکا ہے۔جہاں جہاں شیشے لگے ہوئے تھے۔وہاں وہاں اب دھاتی شیٹ لگا دی گئی ہے، یا پھر پلائی ووڈ سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔بقول شخصے پورا شہر جیل کا منظر پیش کر رہا ہے۔

لوٹ مار اور آتشزدگی کے بے شمار واقعات ہوئے ہیں۔اسی تناظر میں جب میں نے حالات سے آگاہی کے لئے اپنی سیکرٹری مارسیلا سو کر سے اس کی رائے جاننے کی کوشش کی، وہ اس قسم کی تحریکوں کے سخت خلاف تھی۔مظاہرین کے متعلق ہماری سیکرٹری کا کہنا ہے کہ یہ سب لوگ ہڈحرامی مارچ کر رہے ہیں۔کام کے بغیر زندگی گزارنے کے خواہشمند حضرات کا یہ مجموعہ ہے جو احتجاج کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔مزید برآں ان سب دنگے ،فسادات کے پیچھے کمیونسٹ پارٹی ہے۔دلیل کے طور پر اس نے شہر میں کوکا کولا فیکٹری اور میکڈونلڈ کی جلی ہوئی خستہ عمارتیں دکھائیں جن پر بلوائیوں نے ہلا بولا تھا۔ہماری دوست مارجوری مگر ان خیالات سے متفق نہیں اور وہ اس احتجاجی تحریک کے ہراول دستے میں شامل ہے۔مارچ کی قیادت کرتے ہوئے باغیانہ پلے کارڈ اٹھائے اس کی تصاویر اخبارات اور ٹیلی ویژن پر موجود ہونے کے سبب اس کے بہی خواہ اسے

احتیاط کا مشورہ دے رہے ہیں، بات میں وزن یوں بھی ہے کہ مارجوری کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں کرسمس کی دستک کے ساتھ ہی احتجاج میں بریک آ گئی کہ چلی کی اکثریتی آبادی کیتھولک عقیدہ عیسائی مذہب کی پیروکار ہے۔ دسمبر کی ابتداء کے ساتھ ہی کرسمس کے فلیٹ شہر بھر میں گشت کرنے لگتے ہیں۔ سجی سجائی، مذہبی گیت بکھیرتی ان گاڑیوں پر سانتا کلاز کے بھیس میں اور کرسمس کے مخصوص سرخ وسفید رنگ میں ملبوس نوجوان قریہ قریہ، بستی بستی گلیوں، محلوں میں بچوں کو میٹھی گولیاں اور ٹافیاں تقسیم کرتے نظر آتے ہیں۔ مخصوص آہنگ میں لاؤڈ سپیکرز پر خو، خو، خو اور جنگر بیل کی آواز لگاتے جاتے ہیں۔ جہاں کوئی بچہ نظر آئے اس کی طرف ٹافیاں اچھال دیتے ہیں۔

کرسمس گزرنے کے ساتھ ہی احتجاج اور جلاؤ، گھیراؤ نے سر اٹھالیا ہے۔ کل شام میں گھر واپس جا رہا تھا کہ شہر کی مصروف ترین شاہراہ کے سگنل پر مظاہرین سے مڈبھیڑ ہو گئی، ہوا یوں کہ جیسے ہی ٹریفک کا سگنل بند ہوا چند نقاب پوش لڑکے، لڑکیوں نے پرانے ٹائر اور لکڑی کے کریٹ سڑک پر ایک لائن میں لگا کر ان کو آگ لگا دی۔ اتفاق سے یہ سب میری گاڑی کے سامنے ہو رہا تھا۔ میں ہمت کر کے باہر نکلا اور اپنی گاڑی کے سامنے پڑے لکڑی کے کریٹ کو ہٹانے لگا، جس میں آتش گیر مادہ تھا۔ میں نے مظاہرین سے گزارش کی کہ مجھے گزرنے دو، بعد میں سڑک بند کر لینا۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ میری بات مان لی گئی اور احتجاجی لڑکے نے اپنے ہاتھ سے جلتا کریٹ ہٹا کر میری گاڑی گزار دی۔ ایک دوست نے اس حُسنِ سلوک کی وجہ میرا غیر ملکی ہونا بیان کیا ہے۔ نئے سال کی خوشی میں ہونے والی آتش بازی کے تمام پروگرام منسوخ کر دیئے گئے جو کہ روایت کا حصہ رہی ہے مگر اس حکومت کا اصل چیلنج شائد مارچ میں آئے گا جب نئے طلباء کے تعلیمی اداروں میں داخلے مکمل ہو جائیں گے۔

لاتیرانا کا عرس

دنیا کے نقشے میں تو لوگ عام طور پر چلی، پیرو اور بولیویا کو ہی مشکل سے ڈھونڈ پاتے ہیں، پھر وہ دورافتادہ شہر جہاں ان ممالک کی سرحدیں ملتی ہیں، بہت ہی کم ہمارے دیسی لوگوں کی نظروں میں آپاتے ہیں۔ یہ منظر ایک دور دراز قصبے کا ہے۔ جنگل میں منگل کا سماں ہے۔ فضا انتہائی جذباتی ہے۔ کلیسا کا مرکزی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، مغرب کا وقت ہے اور قندیلیں کثیر تعداد میں جگمگا رہی ہیں، زائرین میں اکثریت نوجوانوں کی ہے۔ لڑکیاں زاروقطار رو رہی ہیں اور مناجات میں مشغول ہیں۔ لڑکوں کی اکثریت بھی آبدیدہ نظر آرہی ہے۔ زیادہ تر حاضرین جوڑیوں کی شکل میں یہاں آتے ہیں۔ سرخ روئی ہوئی آنکھوں اور ان میں نمی کے بغیر ہم جیسے سیاح یہاں کم ہیں، غالب اکثریت مذہبی جوش و جذبے سے نہ صرف پورے چلی کے طول عرض سے یہاں آئی ہے بلکہ جنوبی امریکہ کے ہمسایہ ممالک سے آنے والوں کی تعداد بھی سینکڑوں میں ہے۔ ایک ہزار کی مقامی آبادی والے اس چھوٹے سے قصبے میں، جسے گاؤں کہنا زیادہ مناسب ہے، سال کے ان دنوں میں دو سے تین لاکھ لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس قصبے کا نام لاتیرانا ہے، اور جس تہوار کے لئے یہاں لاکھوں لوگ اکٹھے ہوئے ہیں وہ اسی ہستی لاتیرانا سے منسوب عرس یا میلہ ہے۔ عرس کا مطلب چونکہ شادی ہے اور صوفیاء کرام موت کو وصال قرار دیتے ہیں، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات کی تفصیل میں جائے بغیر میں یہ لفظ مستعار لے رہا ہوں۔ چونکہ آئندہ آنے والی تفصیل سے بھی آپ کو اس میلے کے لئے عرس کا لفظ ہی مناسب

لگے گا۔ مسیحی دنیا اس ہستی کو ''لیڈی آف کارمل'' کے نام سے جانتی ہے۔ مذکورہ معبد اس جگہ قائم ہے جہاں لاتیرانا نے جان دی تھی۔ مرجع خلائق اس گرجا گھر کے گرد ہر سال جولائی کے وسط میں لاکھوں کی تعداد میں جمع ہونے والے زائرین کا تذکرہ بعد میں کریں گے، پہلے صاحب مزار کی بات کرتے ہیں۔

یہ کہانی پانچ صدیاں پرانی ہے۔ جنوبی امریکہ کے ساحلوں پر جب یورپی بحری جہاز لنگرانداز ہونا شروع ہوئے اور براعظم شمالی وجنوبی امریکہ کو اپنی نوآبادی بنانے کا سلسلہ شروع کیا ۔ یہ 1540 عیسوی کا واقعہ ہے جب دنیا کی سب سے قدیم تہذیب ''ان کا'' سے تعلق رکھنے والی ایک جنگجو شہزادی نے یورپی حملہ آوروں اور قابضین کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ آٹھ ہزار سال قدیم تہذیب کی وارث اس جارحانہ مزاج شہزادی کا اصل نام تو ذرا مشکل ہے مگر تاریخ میں یہ ''لاتیرانا'' کے نام سے معروف ہوئی۔ لاتیرانا کا مطلب آمرانہ مزاج کی حامل ، جابر حکمران، بے رحم عصیلی، تندخو کیا جاسکتا ہے، مگر جابر شہزادی یا ظالم حسینہ حکمران سب سے مناسب ہوگا۔

اساطیری کردار کی حامل یہ ریڈ انڈین شہزادی یورپ کے لوگوں سے شدید نفرت کرتی تھی۔ اپنے لوگوں اور زمین کے تحفظ کے لئے یہ یورپی جارحین کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئی تھی۔ اس کی گھڑسواری اور تیراندازی کی تاریخ میں مثال دی جاتی ہے۔ ایسی خطرناک جنگجو کہ جو بھی یورپی یا عیسائی اس کے راستے میں آتا، وہ اسے قتل کردیتی تھی یا پھر اپنا قیدی بنا کر مشقت لیتی تھی۔ وہ کوئی عام نازک اندام شہزادی نہ تھی بلکہ ایک فوجی کمانڈر تھی جس کی اپنی ذاتی ملیشیا تھی، ایسی منتقم مزاج کہ چھوٹی سی غلطی بھی کسی کی معاف کرنے کی روادار نہ تھی۔ پھر یوں ہوا کہ محبت نے اس کے دل کے دروازے پر دستک دے دی۔ وہ پرتگالی لڑکا اس جنگجو شہزادی کا قیدی تھا۔ جیسے مثل مشہور ہے کہ ''عشق نہ پچھے ذات''

یہ عشق لاتیرانا کے اپنے ہی نظریات کی مکمل نفی تھا۔ ان دنوں یورپی حملہ آور ریڈ انڈین لوگوں کے خون کے پیاسے تھے اور مقامی لوگ یورپی گھس بیٹھیوں کی جان کے درپے تھے۔ شہزادی نے پرتگالی نوجوان کی محبت میں اقتدار بھی ٹھکرا دیا اور اپنی فوج سے بھی

دستبردار ہوگئی۔ بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی، اس نے اسی محبت میں عیسائیت قبول کر لی۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ لا تیرانا کے عیسائیت قبول کرنے کی وجہ اپنے عیسائی عقیدہ محبوب سے شادی کے علاوہ موت کے بعد ابدی زندگی میں اس سے ملن کا تصور تھا۔ قبیلے کے لوگوں اور اس کی رعایا کو اس شادی اور تبدیلی مذہب نے مشتعل کر دیا۔ اسی اشتعال کے نتیجے میں لا تیرانا اور اسکے پرتگالی محبوب کو اپنے ہی لوگوں نے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ ان کی قبر پر اٹھارویں صدی میں ایک فنِ تعمیر کا شاہکار کلیسا تعمیر کیا گیا جو اب مرجع خلائق ہے۔ یہ تاریخی معبد جہاں لا تیرانا نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کی تھی، مقامی ثقافت اور کیتھولک روایات کی باہمی آمیزش کا بہترین نمونہ ہے۔ اس معبد کی بھیڑ میں مجھے بولیویا سے تعلق رکھنے والی اپنی گھریلو خادمہ نظر آئی، سرخ روئی ہوئی آنکھوں میں نمی اور ساتھ ایک نوعمر لڑکا تھا، دونوں بڑے خشوع و خضوع سے مناجات میں مشغول تھے۔ یہ مگر شام کا منظر ہے، دن کے وقت رنگ برنگے لباس پہن کر ہزاروں لوگ ٹولیوں کی شکل میں موسیقی کی دھنوں پر رقص کرتے ہوئے شہر بھر کا چکر لگاتے ہیں اور یہ مذہبی رقص مرکزی کلیسا پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ تمام دن یہ جلوس قدم بہ قدم چلتے ہیں۔

لا تیرانا کے میلے پر رقص کرنے کے لئے منتیں مانی جاتی ہیں۔ کسی کی آرزو پوری ہو جائے یا مراد پوری ہونے کی آرزو لے کر ہر عمر کے افراد تمام دن گلیوں میں طبل و علم لے کر رقصاں نظر آتے ہیں۔ اس عمل کو بڑی مذہبی تکریم حاصل ہے، ہماری سیکرٹری مارسیلا اپنی بیٹی کے بارے میں بتا رہی تھی کہ میری بچی بڑی مذہبی اور عبادت گزار ہے، ہر سال لا تیرانا کے عرس پر رقص کرتی ہے۔ ساحل سمندر پر واقع شہر اقیقی سے یہ معبد ستر کلومیٹر ہے، اس شہر میں کوئی دو سو پاکستانی رہتے ہیں اور تقریباً سبھی کاروباری لوگ ہیں چونکہ یہ شہر ٹیکس فری زون ہے۔

اس شہر میں ایک عظیم الشان مسجد موجود ہے جس کی تعمیر کا سہرا پاکستانی مسلمانوں کے سر سجا ہے۔ حالانکہ بڑی دیر سے یہاں عرب اور ترک مسلمان بھی آباد تھے۔ یہ سعادت مگر ہمارے ہم وطنوں کے حصے میں آئی۔ ہمارے ایک دوست نے لاکھوں ڈالر مالیت کا اپنا کارنر پلاٹ مسجد کی تعمیر کے لئے مفت فراہم کر دیا۔ دیگر دوستوں نے بھی دل کھول کر اس کی تعمیر میں حصہ ڈالا اور دیکھتے ہی دیکھتے کروڑوں روپے کی مالیت کا یہ منصوبہ اپنی تکمیل کو پہنچا۔ اب یہ شہر کا ایک اہم

آئیکون ہے، جسے مؤذنِ رسول کے نام پر مسجد بلال کا نام دیا گیا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ لا تیرانا کے اسی قصبے میں جہاں جنگجو شہزادی نے محبت کی خاطر جان دی، عیسائیت قبول کی اور اب ویٹی کن سٹی میں اسے ''خدا کی ولی'' تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے کلیسا کے کچھ ہی فاصلے پر بھی ایک مسجد اور مسلمانوں کا قبرستان بھی موجود ہے۔ اس کی تعمیر کی سعادت ہمارے دوست اور ہمسائے مبین بھائی کو ملی ہے۔ میں جب بھی اس طرف جاؤں، قبرستان ضرور جاتا ہوں۔ چونکہ وہاں ہمارے ایک عزیز دوست اور ساتھی دفن ہیں، بچپن میں قبرستان جانے سے ڈر لگتا تھا۔ مگر پھر کسی نے سمجھایا کہ جب کوئی اپنا قبرستان میں دفن ہو جاتا ہے تو پھر یہ سارا خوف مٹ جاتا ہے۔ ایک اپنائیت اور انسیت اس خوف کی جگہ لے لیتی ہے۔ لا تیرانا کا یہ مسلم قبرستان بھی بہت اپنا لگتا ہے چونکہ یہاں ہمارے دوست مدفون ہیں۔ ایک ایسی خاتون کی بھی قبر ہے جو مطالعہ کے بعد مسلمان ہوئی اور اس خاتون نے وصیت کی تھی کہ مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اس کا بیٹا عیسائی ہے مگر اس نے اپنی ماں کی آخری خواہش پوری کر دی، چونکہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس خاتون کی قبر پر میں فاتحہ ضرور پڑھتا ہوں۔

ہمبر سٹون

سلطنت برطانیہ کے زیر تسلط رقبہ جب اس قدر وسیع و عریض تھا کہ اس میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، نو آبادیاتی عہد کے عروج کے اس دور میں بھی انگریز کبھی براعظم جنوبی امریکہ میں داخل نہیں ہوا تھا۔ شاید سپین اور پرتگال کے ساتھ اس کا یہ خاموش معاہدہ تھا کہ ''ادھر ہم، ادھر تم'' اسی وجہ سے وہ شمالی امریکہ کی طرف اپنی سلطنت کو توسیع دیتا رہا۔ جنوبی امریکہ کے بحرالکاہل کے ساتھ ساحل پر نظر دوڑائیں تو نقشے میں چلی کی حدود میں واقع پیرو اور بولیویا کی سرحد کے قریب، ایک شہر کا انگریزی نام پڑھ کر آدمی ٹھٹک جاتا ہے، ''ہمبر سٹون'' خالص انگریزی نام ہے۔ ورنہ پورے براعظم میں شہروں کے ہسپانوی یا پرتگیزی نام ہی سنتے ہیں، یا پھر مقامی قبائلی قدیم ناموں کے ساتھ ساتھ کہیں ولندیزی اور بہت ہوا تو کوئی اطالوی نام نظر آ جاتا ہے۔ مگر انگریز اور اس کی زبان انگریزی کا ادھر سے گزر نہیں ہوا۔

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کی جانب سے اس شہر کو عالمی ورثہ قرار دیا گیا ہے۔ شاید یہ نام کی کشش تھی جو مجھے اس شہر میں لے گئی۔ کہنے کو تو اس شہر کو بھوت نگر یا اجڑا دیار بھی کہا جا سکتا ہے مگر آثار قدیمہ کہتے ہوئے جھجک رہا ہوں کیونکہ یہ جدید طرز کا شہر ہے اور اب پورے شہر کو عظیم الشان میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یوں کہنا زیادہ موزوں ہے کہ ہمبر سٹون اب کوئی آبادبستی نہیں بلکہ آثار قدیمہ کا بہت بڑا میوزیم ہے۔ اس دیار کا فقط نام ہی انگریزی نہیں، تمام طرز تعمیر بھی برطانوی ہے، اگر کسی نے جنوبی امریکہ میں انگریزی طرز کی جھلک دیکھنا ہو تو اس کے لیے ہمبر سٹون

سے بہتر جگہ کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس شہر کے بسنے اور اجڑنے کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ یہ کہانی زمین کی زرخیزی کے لیے استعمال ہونے والی کھاد سوڈیم نائیٹریٹ کے ارتقاء سے جڑی ہوئی ہے۔ ہمبرسٹون بنیادی طور پر اس کھاد فیکٹری کا نام تھا۔ جو یہاں سوڈیم نائٹریٹ بناتی تھی۔ جسے سائنسی زبان اور عرف عام میں اب بھی چلی کی نسبت سے چلی سالٹ پیٹر کہا جاتا ہے۔ اس مقام کا اگر یوں تعارف کروایا جائے تو سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ ٹھیک ایک صدی پہلے پوری دنیا میں استعمال ہونے والی زمین کی زرخیزی برقرار رکھنے کا باعث نائیٹریٹ کھاد کا 65% حصہ اس فیکٹری میں تیار کیا جاتا تھا، یہ کوئی مبالغہ نہیں، اعداد وشمار کے علاوہ آثار بتاتے ہیں کہ واقعی 65 فیصد اس فیکٹری میں تیار ہوتا ہوگا۔ فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے لاطینی امریکہ کے مقامی باشندے طویل عرصے سے سوڈیم نائیٹریٹ کا استعمال کرتے آرہے تھے، یورپ میں اس کی ڈیمانڈ تب بڑھی جب بم بنانے کے لیے، دھماکہ خیز مواد کے طور پر سالٹ پیٹر کا استعمال اور طلب بڑھ گئی۔ صدیوں سے ریڈ انڈین جسے زمین کی زرخیزی کا ٹوٹکہ کہہ کر استعمال کرتے آرہے تھے، اسے 1830 عیسوی میں سائنسدانوں نے تجربات کے بعد تسلیم کیا اور مہر تصدیق ثبت کر دی کہ یہ سوڈیم نائیٹریٹ زمین کی زرخیزی بڑھانے کے لیے واقعی کارگر ہے، اس سے نائیٹریٹ کی صنعت نے مزید رفتار پکڑ لی۔

اس کھاد فیکٹری کا رہائشی علاقہ قابل دید ہے، ساڑھے تین ہزار نفوس پر مشتمل یہ ایک جدید شہر کا نمونہ تھا۔ ٹینس، باسکٹ بال، بیڈ منٹن کے علاوہ وہ فٹ بال کا وسیع وعریض میدان، اتنے سارے کھیلوں کا اہتمام کہ گنوانا مشکل ہے، اسپتال، سینما، تھیٹر، اوپیرا ہال، مختصر یہ کہ ایک جدید شہر میں جو سہولیات آپ سوچ سکتے ہیں وہ تمام یہاں پر مہیا کی گئی تھیں۔ جنگل میں منگل کی عملی تصویر نظر آتا ہے یہ علاقہ۔ انگریزی طرز تعمیر کے اس رہائشی علاقے میں داخل ہوں تو لگتا ہے جیسے پاک وہ ہند کے کسی قدیم روایتی ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو رہے ہیں، برصغیر کا ریلوے نظام بھی چونکہ انگریز کا تعمیر کردہ ہے اس لیے مماثلت قابلِ فہم ہے۔ یہاں ہمبرسٹون نامی برطانوی شہری اور سائنسدان کا بھی تذکرہ کرتا چلوں۔ جس نے یہ فیکٹری قائم کی پھر اس کی دیکھا دیکھی چند اور فیکٹریاں بھی بن گئیں۔ مگر پھر بھی اس مقام کو نائیٹریٹ کی پیداوار کے لیے سائنسی بنیادوں پر چننے کا سہرہ

اسی کے سر پر بندھتا ہے، جس نے صحراؤں کی خاک چھان کر یہ جگہ تلاش کی تھی اور کھاد فیکٹری اس بیابان میں قائم کی۔

اس کھاد پلانٹ کے قریب ترین بندرگاہ ستر کلومیٹر کی دوری پر اقیقی شہر کی تھی۔ اقیقی کی بندرگاہ اس وقت تک بس مچھلیاں وغیرہ پکڑنے والی کشتیوں تک محدود تھی مگر ہمبرسٹون سے پیدا ہونے والی کھاد کی برآمد کے سبب یہ پورٹ دن دگنی اور رات چگنی ترقی کرنے لگی۔ اس بندرگاہ کا تمام تر انحصار اسی سالٹ پیٹر کی برآمد پر تھا۔ یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کہ اس وقت یہ کھاد کا پلانٹ اور شہر اقیقی پیرو کا حصہ تھے، چلی اور پیرو کے درمیان ہونے والی جنگ جس کے نتیجے میں یہ شہر اور سینکڑوں میل کا علاقے چلی کے قبضے میں چلا گیا، اس جنگ کے اسباب میں ایک بنیادی محرک یہ اور اس سے ملحقہ کھاد پلانٹ تھے جو ہمبرسٹون میں واقع تھے۔

بحرالکاہل کی جنگ سے تاریخ میں یاد کی جانے والی اس لڑائی میں برطانیہ نے چلی کی حمایت کی تھی اور چلی نے برطانیہ کو یقین دلایا تھا کہ اگر وہ اس کی جنگ میں مدد کرے تو اس فیکٹری کو قومیا یا نہیں جائے گا، یہ وعدہ وفا بھی ہوا مگر جنگ کے نتیجے میں بولیویا سمندر سے محروم ہو گیا اور پیرو اپنے سینکڑوں مربع میل رقبے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

عروج کے زمانے میں تشہیر کے لیے بنائے گئے اشتہار دیکھ کر خوشگوار حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب دہلی کے ڈسٹی بیوٹر کی جانب سے جاری کردہ اشتہار میں ایک پنجابی کسان نائیٹریٹ کے استعمال کے سبب کپاس اور مکئی کی بھرپور فصل اٹھا کر مالا مال اور دوسری تصویر میں کسان نائیٹریٹ استعمال نہ کر کے بدحال، پریشان و پشیمان دکھایا گیا ہے۔ چین و عرب سے لے کر ہندوستان اور برازیل تک ملکوں ملکوں چلی کی قدرتی کھاد سوڈیم نائیٹریٹ کے اشتہارات اور ہر زبان میں تعریف، توثیق عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتی ہے۔

زوال کی داستان بھی کمال دلچسپ ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے ہنگام برطانیہ کی خواہش اور ایما ء پر جرمنی کو سوڈیم نائیٹریٹ کی برآمد چلی نے بند کر دی، اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو چلی سالٹ پیٹر دھما کہ خیز خصوصیات کے باوصف بم سازی میں استعمال ہوتی تھی، اور دوسری وجہ زمین کی زرخیزی اور فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے یہ کھاد معاون تھی۔ ہر دو صورتوں میں یہ صورتحال

انگلستان کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا بحرالکاہل کی جنگ میں پیرو اور بولیویا کے خلاف برطانیہ عظمیٰ نے چلی کا ساتھ دیا تھا جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ پلانٹ، شہر بلکہ ہزاروں مربع میل کا علاقہ فتح کرنے میں وہ کامیاب ہوسکا۔ اسی لیے وہ برطانیہ کا پہلی جنگ عظیم میں ساتھی اور حلیف تھا۔ عالمی سچائی پر مبنی ایک مقولہ ہے جو دنیا کی ہر زبان میں الفاظ کے تھوڑے بہت ردّو بدل کے ساتھ موجود ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔

جرمنی کو نائیٹریٹ کی فراہمی پر مکمل پابندی اور بندش کا نتیجہ نئی ایجاد کی صورت میں سامنے آیا، وہ تھی جرمنی کی جانب سے لیبارٹری میں تیار کردہ مصنوعی سوڈیم نائیٹریٹ۔ اس مصنوعی سالٹ پیٹر کی ایجاد نے چلی کے شمالی علاقے میں واقع کھاد کی پیداوار کی اس صنعت کی بربادی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اندازہ لگالیں کہ سن 1910ء میں دنیا بھر میں استعمال کی جانے والی سوڈیم نائیٹریٹ کا دو تہائی حصہ اس شہر میں پیدا ہوتا تھا، اگلے بیس برس میں وہ کم ہوکر فقط دس فیصد تک رہ گیا۔ جب سن 1950ء آیا تو پیداوار کا یہ تناسب عالمی پیداوار کا فقط تین فیصد حصہ رہ گیا تھا۔ جیمز تھامس ہمبرسٹون کا بسایا ہوا یہ شہر 1960ء تک مکمل طور پر اُجڑ چکا تھا۔ سلوادور آیندے کی سوشلسٹ حکومت نے اسے 1970 میں قومی ورثہ قرار دے دیا۔ 2005ء میں اس نگر کو عوام الناس اور سیاحوں کے لیے دوبارہ کھولا گیا، اب یہ میوزیم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسی سال اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کی جانب سے اسے عالمی ثقافتی ورثہ قرار دے دیا گیا۔ کھاد فیکٹری کی مینار نما سو میٹر اونچی چمنی سے اب دھواں نہیں اٹھتا۔ مگر سڑک پر سفر کرنے والے مسافروں کو یہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ گزرے ہوئے عہد کا اعلان اور تعارف دور سے ہی یہ آہنی چمنی کروادیتی ہے۔

قطر کا صحرائی گلاب

عرب ممالک میں پٹرولیم مصنوعات سے حاصل کردہ دولت کی ریل پیل اب کوئی نئی بات نہیں رہی۔تیل کی دولت کو برادر اسلامی ممالک کے حکمران بلند و بالا عمارات اور تفریح و آسائش کے لئے کیسے استعمال کرتے رہے ہیں، یہ بھی پرانا قصہ ہے۔اس سارے منظرنامے میں ایک جزیرہ نما چھوٹا سا ملک قطر پوری دنیا کو مسلسل حیران کئے جا رہا ہے۔تیس لاکھ سے بھی کم نفوس پر مشتمل اس ملک کے پاس کتنا تیل اور کتنی گیس ہے میں اس بات سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوں اور نہ ہی یہ میرا موضوع ہے۔ہاں! البتہ اپنے وسائل کو جس مثبت اور تعمیری انداز میں قطر کے شاہی خاندان نے استعمال کیا ہے، وہ قابل تحسین اور تقلید کرنے کے لائق ہے۔پہلی مرتبہ دنیا کو حیرت میں مبتلا کرنے کا سبب تو الجزیرہ ٹی وی چینل بنا تھا۔جب 1996 میں حکومتی سرمایہ کاری سے عربی زبان میں یہ آزاد منش نیوز چینل اپنا آغاز کر رہا تھا،تو اس کے سامنے جزیرۃ العرب میں آزاد صحافت کی کوئی مثال موجود نہ تھی۔جب اسامہ بن لادن کے ویڈیو بیانات اس ادارے نے نشر کئے تو راتوں رات عالمی سطح پر یہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ساٹھ اسلامی ممالک میں آج بھی کوئی نشریاتی ادارہ بڑی مشکل سے الجزیرہ کے مقابلے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

کھیل کے میدان میں تو قطر نے کمال ہی کر دیا۔فٹ بال کی بات کریں تو وہ تاریخ کا پہلا عرب اور مسلم ملک ہوگا جسے 2022 میں ورلڈ کپ کی میزبانی کا موقع ملے گا۔اس وقت قطر میں سات نئے اسٹیڈیم اپنی تعمیر کے آخری مراحل میں پہنچ چکے ہیں۔جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ اس

ملک کی آرٹ اور کلچر کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششیں ہیں۔ خوشگوار حیرت ہوئی جب قطر کا اسلامی آرٹ میوزیم دیکھنے گیا۔ چودہ صدیوں میں ارتقاء پانے والا اسلامی فنون لطیفہ کو جس محنت اور محبت کے ساتھ کئی ایکڑ پر پھیلی پانچ منزلہ عمارت میں ایک جگہ اکٹھا کیا گیا ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔عجائب گھر کی پانچ منزلہ بے ستون عمارت بذات خود فن تعمیر کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ڈیڑھ ہزار سال میں ارتقاء پذیر ہونے والے اسلامی آرٹ کو ایک چھت کے نیچے جمع کر لینا یقیناً ایک بڑا کارنامہ ہے مگر آج دنیا بھر میں جس کی دھوم مچی ہوئی ہے وہ قطر میں تعمیر ہونے والا نیا نیشنل میوزیم ہے۔شاہی محل سے متصل اس عجائب گھر کے خالق فرانس سے تعلق رکھنے والے عہد ساز ماہرِ تعمیر جین نویل ہیں۔عجائب گھر کا نام ہی آپ کو سحر میں مبتلا کر دیتا ہے ''زھراۃ الصحرا''یعنی صحرا کا گلاب۔دس سال میں تکمیل پانے والے پچپن ہزار مربع فٹ رقبے پر پھیلے اس میوزیم کی عمارت کے ساتھ ایک کلو میٹر طویل مصنوعی جھیل تعمیر کی گئی ہے۔اور پچیس ایکڑ کا پارک بھی ماہرِ فنِ تعمیر نے بنوایا ہے۔

نیویارک ٹائمز میں گزشتہ ماہ جب اس صحرائی گلاب نامی عجائب گھر کے افتتاح کی خبر پڑھی اور اربوں ڈالر کی لاگت سے تعمیر کی تکمیل کو پہنچنے کا ذکر پڑھا تو اسے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔دوحہ شہر میں جب اس عمارت کے سامنے پہنچا تو سمجھ میں آیا کہ اس کا نام خالق نے ''DESERT ROSE'' کیوں رکھا ہے۔عمارت کیا ہے گویا صحرا کا گلاب سامنے رکھا ہے۔جب پچاس ریال کا ٹکٹ لیکر اندر داخل ہوا اور غیر ملکی سیاحوں سے گپ شپ ہوئی تو انکشاف ہوا کہ آدھے لوگ تو جین نویل کی محبت میں فقط فنِ تعمیر کا یہ شاہکار عمارت دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔

رمضان المبارک کے احترام میں عجائب گھر کے اوقات کاریوں ترتیب دیئے گئے ہیں کہ رات کو افطار کے بعد آٹھ بجے یہ کھلتا ہے اور آدھی رات یعنی 12 بجے یہ بند ہو جاتا ہے۔مقامی لوگوں کے لئے یہ داخلہ مفت ہے،مگر مقامی لوگ تو بہت کم ہیں یعنی اٹھائیس لاکھ،جن میں سے صرف شہریت کے حامل اصلی،نسلی قطری تو صرف تین لاکھ کی آبادی ہیں۔

اربوں ڈالر کی پینٹنگز جو حکمران التھہانی خاندان کی ملکیت ہیں،انسانی تاریخ کے عظیم ترین

مصوروں کے یہ فن پارے میری توقع کے برعکس عجائب گھر میں موجود نہیں تھے۔ مزے کی بات مگر یہ ہے کہ اس کے باوجود یہ میوزیم میری توقعات سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ قطر کی پوری تاریخ درودیوار پر اس طرح آویزاں ہے کہ دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ اس دنیا کی ابتداء سے لے کر جزیرۃ العرب کے افریقہ سے زمینی طور پر کٹ کر جدا ہونے کے ارتقائی عمل سے لے کر آج کے دن تک لمحہ بہ لمحہ کس طرح اہم واقعات رونما ہوئے سب سامنے پڑا ہے۔ دنیا کے کئی براعظموں میں پھیلے درجنوں عجائب گھروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، مگر جدید ٹیکنالوجی کا اس قدر زیادہ استعمال اور اس خوبصورتی کے ساتھ کہیں نہیں دیکھا ہے۔ آثارِ قدیمہ کو دیکھتے ہوئے میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے آثار بھی کاش اسی طرح ہم دنیا کے سامنے پیش کرسکیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے ملک کے وسائل محدود اور دیگر اہم مسائل بھی موجود ہیں مگر ایک وجہ شائد ترجیحات کی ترتیب بھی ہے۔ وسائل تو تقریباً تمام عرب ممالک کے پاس موجود ہیں مگر ''زہراۃ الصحراء'' جیسا میوزیم تعمیر کرنے کا شائد وہاں کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ اس منصوبے کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس عجائب گھر کی ڈائریکٹر شاہی خاندان کی اہم رکن شہزادی آمنہ بنت عبدالعزیز خود ہیں۔

قطر چھ رکنی عرب تنظیم گالف کارپوریشن (GCC) کا رکن ہے مگر کچھ سال قبل سعودی عرب، جو کہ اس تنظیم کا ڈیفیکٹو سربراہ ہے، کی جانب سے قطر پر اقتصادی پابندیاں عائد کردی گئیں۔ دیگر تمام رکن ممالک اور مصر نے بھی سعودی عرب کی پیروی کرتے ہوئے ایسا ہی کیا۔ یاد رہے کہ قطر کا واحد زمینی بارڈر سعودی عرب کے ساتھ ملتا ہے، اس لئے سیاسی اختلافات کی بنیاد پر عائد کی گئی ان پابندیوں نے قطر کو ابتدائی دنوں میں تو ہلا کر رکھ دیا، دودھ، دہی پنیر تک کمیاب تھے، چونکہ سب سعودی عرب سے آتے تھے۔ مگر فوراً قطر ائیرلائن اور ائیرفورس کے جہازوں پر آسٹریلیا سے گائیں درآمد کی گئیں اور باقی مسائل پر بھی اسی طرح قابو پانے کی کوشش جاری ہے۔ سچ پوچھیں تو یہ پابندیاں قطر کی خودمختاری اور روشن مستقبل کے لیے ایک نعمت ثابت ہوئی ہیں۔ ایک خیریت پسند ریاست جو کہ آزادانہ خارجہ پالیسی پر یقین رکھتی ہے۔ قطر کا نیا عالمی تصور جیسا خوشگوار ہے ویسی ہی خوشگوار حیرت اس کی سیاحت کے دوران محسوس ہوتی ہے۔

سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک نے قطر پر اخوان المسلمین کی پشت پناہی ،دہشت گردوں کی مالی معاونت اور دہشت گردی کے فروغ کا الزام لگا کر یہ پابندیاں قطر پر نافذ کی تھیں،قطر سے الجزیرہ ٹی وی بند کرنے کا مطالبہ کیا گیا، جسے قطر نے مسترد کر دیا۔ پاکستان نے اس موقع پر برادر عرب ممالک کے دباؤ آنے کی بجائے اس سلسلے میں خود مختار خارجی پالیسی اپنائی اور قطر کے ساتھ اپنے روایتی سفارتی تعلقات کو قائم رکھا۔اقتصادی بحران کے دوران پاکستان اور قطر کے تعلقات میں مزید گرمجوشی دیکھنے میں آئی۔شائد اسی کا نتیجہ ہے کہ اب قطر میں پاکستانیوں کو داخلے کے لئے پیشگی ویزے کی ضرورت نہیں ہے۔میرا قیام انتہائی مختصر تھا مگر امیگریشن حکام نے میرے پاکستانی پاسپورٹ پر ایک مہینے کا ویزا موقع پر لگا دیا اور اس ویزے کی کوئی فیس بھی نہیں ہے۔بلاشبہ ریاست کی خارجہ پالیسی کے اچھے اور برے اثرات اس کے شہریوں تک بھی ضرور پہنچے ہیں۔

سوویت انقلاب کے سو سال

آئندہ نسلوں کو تو شاید معلوم بھی نہ ہو کہ سوویت یونین نام کا بھی ایک ملک اس کرہ ارض پر ہوا کرتا تھا۔ واقفان حال مگر جانتے ہیں کہ گزشتہ صدی کی یہ سپر پاور ہوا کرتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کا فاتح اور انسان کو پہلی مرتبہ خلا کی رفعتوں سے روشناس کروانے والا دیس۔ ایک طرف جس کی سرحدیں ہمارے ہمسائیوں، افغانستان، چین اور ایران سے ملتی تھیں تو دوسری طرف امریکہ سے متصل تھیں۔ یورپی یونین کے کئی ممبر ممالک اس سوویت ریاست کا حصہ تھے اور پورا مشرقی یورپ اس کے سامنے سجدہ ریز تھا۔ ہٹلر کو شکست دینے کے بعد جرمنی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مشرقی جرمنی میں اسی کا نظام چلتا تھا۔ انسانی تاریخ کی رقبے کے اعتبار سے یہ سب سے بڑی ریاست تھی۔ یہ نظریاتی ریاست ایک انقلاب کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔ اس اکتوبر میں اس تاریخی انقلاب کو سو سال پورے ہو گئے ہیں۔ انقلاب کا پیش خیمہ بننے والا یہ پہلا سوشلسٹ انقلاب تھا، اسی کے نتیجے اور محنت کشوں کی جدوجہد سے صدیوں پرانی روسی بادشاہت کا خاتمہ ہوا، زار کہلانے والا بادشاہ نکولائی اپنے خاندان سمیت قتل کر دیا گیا۔ انقلاب کے مرکزی رہنما ولادیمیر لینن کی قیادت میں کمیونسٹ جنگجوؤں پر مشتمل سرخ سپاہ اور بادشاہ کی وفادار سفید فوج کے درمیان اکتوبر کا آخری عشرہ فیصلہ کن معرکوں کا تھا۔ اسی سبب سے روس میں برپا ہونے والے اس انقلاب کو بالشویک انقلاب، سرخ اور سوویت انقلاب کے علاوہ اکتوبر انقلاب کے نام سے تاریخ کی کتابوں میں یاد کیا جاتا ہے۔

گزشتہ صدی کے اہم واقعات کا ذکر کیا جائے تو دو عظیم جنگوں اور کیمونزم کے ابھار سے کوئی بھی واقعہ زیادہ اہمیت کا حامل نہیں۔ کارل مارکس کے معاشی نظریے کی بنیاد پر برپا ہونے والے سوویت انقلاب کی اہمیت اس لیے سب سے زیادہ ہے کیونکہ اس سے آنے والے اگلے درجنوں طبقاتی جدوجہد پر مبنی سوشلسٹ انقلابات کی راہ ہموار ہوگئی تھی۔ حالانکہ جرمنی کے یہودی خاندان میں پیدا ہونے والے کارل مارکس نے اپنی تحریروں میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ سوشلسٹ انقلاب پہلے صنعتی معاشروں میں برپا ہوگا، جبکہ روس اور اس کے اردگرد کی ریاستیں جن کے اشتراک سے پہلی اشتراکی حکومت وجود میں آئی وہ زرعی معاشرہ تھا۔ اکتوبر انقلاب سے ستر برس قبل جرمن زبان میں ''داس کاپی تال'' اور ''کیمونسٹ مینوفیسٹو'' تحریر کرتے ہوئے مارکس کے ذہن کے کسی کونے میں بھی شاید نہ ہوگا کہ یہ معاشی نظام روس اور چین جیسے زرعی اور دور دراز ممالک میں انقلاب کو جنم دے گا۔ خیر وہ خود تو روسی انقلاب برپا ہونے سے پینتیس برس پہلے ہی جلاوطنی کے دوران لندن میں سپرد خاک ہوگیا۔ اس کے جنازے پر فقط چند ہی لوگ آئے تھے۔ نظریاتی ساتھی اور دوست اینگلز نے قبر پر اپنے تعزیتی خطبے میں کہا کہ کارل مارکس نے انسانی تاریخ پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ جنازے میں شریک ایک دوست نے اینگلز کا تمسخر اڑاتے ہوئے، سرگوشی میں کہا، کہ جس آدمی کے جنازے میں دو درجن افراد بھی اکٹھے نہ ہوسکیں وہ دنیا پر کیا اثرات چھوڑ سکتا ہے؟ وقت نے ثابت کیا کہ کارل مارکس کے متعلق اس کے دوست کے توصیفی کلمات مبالغہ آرائی نہ تھے۔ اس کی نظریاتی حقانیت کا پہلا ثبوت فراہم کرنے والے سوویت بالشویک تھے۔ یہ تذکرہ کرتا چلوں کہ انقلاب کے وقت مختلف ترقی پسند خیالات رکھنے والی جماعتیں جدوجہد میں مصروف تھیں ان میں بالشویک سب سے بڑا گروہ تھا جن کے سربراہ لینن، جنرل سیکرٹری جوزف اسٹالن اور عسکری ونگ کے سربراہ لیون ٹراٹسکی تھے، اسی نے سرخ سپاہ کی بنیاد رکھی۔ لیون ٹراٹسکی سرخ سپاہ کے معمار بھی تھے اور انقلاب کی کمان بھی اسی کے ہاتھ میں تھی۔ روسی زبان میں بالشوئی کا مطلب بڑا ہوتے ہیں اسی سے لفظ بالشویک نکلا ہے۔ روسی زبان پر دسترس کے سبب شاید میں سوویت انقلاب کو عام پاکستانیوں کی نسبت زیادہ وسیع تناظر میں دیکھ اور بیان کرسکتا ہوں۔

سینٹ پیٹرز برگ وہ شہر ہے جس پر روسی فخر کرتے ہیں۔ ماسکو سے پہلے یہ روس کا

دارالحکومت ہوتا تھا۔ بادشاہ زار کا سرمائی محل یہیں ہے۔ انقلاب کی چنگاری اسی شہر میں شعلہ بنی تھی۔ برسبیل تذکرہ روس کے موجودہ صدر ولادیمر پیوتن کے علاوہ انقلاب کے بانی ولادیمر لینن کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ انقلاب کے بعد اس کا نام لینن گراڈ یعنی لینن شہر رکھ دیا گیا تھا۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد پیٹر اول کے تعمیر کردہ اس شہر کو اسی کے نام سے دوبارہ موسوم کر دیا گیا ہے۔ اکتوبر 1917ء کے ان دنوں میں یہاں فیصلہ کن معرکہ برپا تھا۔ ریڈ آرمی کے معمار اور سرخ سپاہ کے کمانڈر نے اپنی دو کتابوں انقلاب روس کی تاریخ اور آپ بیتی میری زندگی میں اکتوبر کی اس فیصلہ کن رات کا تذکرہ بہت تفصیل سے کیا ہے، فقط ایک منظر ملاحظہ فرمائیں۔ لیون ٹراٹسکی لکھتا ہے؛۔

''25 اکتوبر کو ہماری افواج نے سرمائی محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شہری ساری رات امن سے سوئے رہے، انہیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ اقتدار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ ریلوے اسٹیشن، ڈاک خانہ، تار گھر، ٹیلی فون ایجنسی، اور اسٹیٹ بنک۔ سب پر ہمارا قبضہ ہو چکا ہے۔ اسی شام جب ہم سوویتوں کی کانگرس کے افتتاح کا انتظار کر رہے تھے تو لینن اور میں ہال سے ملحقہ ایک کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ کمرہ بالکل خالی تھا، ماسوا کرسیوں کے۔ کسی نے ہمارے لیے فرش پر کمبل بچھا دیا۔ شاید وہ لینن کی بہن تھی جو ہمارے لیے سرہانے لائی تھی۔ ہم ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ جسم اور روح تنے ہوئے تاروں کی طرح تھے۔ ہم نے یہ آرام بڑی محبت کے بعد کمایا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ لہٰذا ہم مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے۔ شورش ختم کرنے کے خیال سے لینن اب مصالحت کر چکا تھا۔ وہ سرخ محافظوں، سپاہیوں، اور جہاز رانوں کے ان ملے جلے ناکوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو شہر میں ہر جگہ لگے ہوئے تھے، لینن کا کہنا تھا ''یہ کیسا حیرت ناک نظارہ ہے۔ محنت کش نے سپاہی کے پہلو بہ پہلو رائفل ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہے اور وہ آگ تاپ رہے ہیں'' وہ اپنے گہرے احساس کو دہرانے جا رہا تھا۔ آخر کار محنت کش اور سپاہی اکٹھے ہو گئے تھے۔

ولادیمر لینن اکتوبر 1917ء سے اپنی وفات 1924 تک اس نوزائیدہ انقلابی اشتراکی ریاست کے سربراہ رہے۔ ترپن برس کی عمر میں اس دارِفانی سے ان کے کوچ کے بعد پارٹی کے

جنرل سیکرٹری جوزف اسٹالن ملک کے سربراہ بنے۔ اسٹالن اپنی سخت گیری کی بنیاد پر نہ صرف دائیں بازو کی سوچ رکھنے والوں کی تنقید کا ہدف رہتا ہے بلکہ ان دنوں بائیں بازو کے دانشور وں کی تنقید کا بھی نشانہ ہے۔ اس کے آہنی ہتھکنڈوں کے سبب یہ تنقید کچھ بے جا بھی نہیں۔ اقتدار سنبھالنے کے چند ہی برس بعد پولٹ بیورو کے چوبیس ممبران میں سے صرف ایک رکن بچا تھا۔ باقی تئیس جلاوطن، قتل یا پھر سائبیریا کی جیلوں میں قید کر دیے گئے تھے۔ لیون ٹراٹسکی جیسے دانشور انقلابی کو میکسیکو کی جلاوطنی کے دوران ہی قتل کروایا دیا گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کیمونسٹ پارٹی کی پولٹ بیورو کا واحد آزاد رکن جوزف اسٹالن خود تھا۔ مگر اس کی شخصیت کا ایک روشن پہلو بھی ہے۔ ہٹلر کو شکستِ فاش دینے اور روس جیسے زرعی معاشرے میں صنعتی انقلاب برپا کرنے والے اس شخص کی جب موت ہوئی تو اس کے اثاثہ جات میں کپڑوں کے تین جوڑے اور دو جوتے کی جوڑیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی بنک اکاؤنٹ اور نہ ہی کوئی مکان۔ آج دنیا بھر کے سیاسی رہنماؤں میں جب پیسے اکٹھے کرنے کی دوڑ لگی ہے، اور اپنے بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے جہنم کا ایندھن اکٹھا کرنے کا مقابلہ نظر آتا ہے، تو یہ بیان معجزہ دکھائی دے گا۔ کہ دوسری جنگ عظیم کے ہنگام، جب اسٹالن سربراہِ مملکت تھا تو اس کا حقیقی بیٹا سوویت یونین کی فوج میں بطور نوجوان لیفٹیننٹ جرمنی کے خلاف اگلے مورچوں پر لڑ رہا تھا۔ جنگ کے دوران جرمن فوج نے اسے گھیرا ڈال کر گرفتار کر لیا اور جنگی قیدی بنا ڈالا۔ جرمن چانسلر ایڈولف ہٹلر چاہتا تھا کہ اسٹالن کے گرفتار بیٹے کے بدلے وہ اپنے ایک اہم فوجی جرنیل کو آزاد کروالے، جو کہ سوویت یونین کی قید میں تھا۔ جب ہٹلر کا یہ پیغام اور جنگی قیدیوں کے باہمی تبادلے کی یہ خواہش لے کر نامہ بر سٹالن کے پاس پہنچا تو اس نے یہ کہہ کہ صا

ف انکار کر دیا کہ ''ایک سپاہی کے ساتھ ایک جرنیل کا تبادلہ نہیں کیا جا سکتا'' اگر چہ وہ سپاہی اسٹالن کا اپنا بیٹا تھا۔ وہ ہٹلر کی قید میں جنگ کے دوران اسی کے کنسنٹریشن کیمپ سے فرار ہونے کی کوشش میں وفات پا گیا۔ اسٹالن کے تیس سالہ دور کا خاتمہ 1953 میں اس کی موت پر ہوا۔ خردشیف کے سربراہ مملکت بننے سے لے کر 1991ء میں میخائل گورباچوف کی نااہل حکومت اور سوویت یونین کے انہدام تک، گزشتہ صدی کا تذکرہ اکتوبر انقلاب اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والی اشتراکی ریاست کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔

ویسٹ انڈیز میں کیا دیکھا

ویسٹ انڈیز کی کرکٹ کو دیکھ کر بچپن سے ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ یہ یقیناً افریقہ کا کوئی ملک ہے۔اس کی وجہ شاید ویسٹ انڈیز کے کھلاڑیوں کا رنگ وروپ اور نین نقش تھے۔بعدازاں پتہ چلا کہ یہ افریقہ میں نہیں بلکہ براعظم امریکہ میں وقوع پذیر ہے۔یہ انکشاف تو میرے لئے بالکل ہی تازہ ہے کہ ویسٹ انڈیز نام کا سرے سے کوئی ملک اس کرہ ارض پر وجود نہیں رکھتا۔یہ براعظم شمالی اور جنوبی امریکہ کے چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل علاقے کو کہا جاتا ہے،امریکی ریاست فلوریڈا کے ساحل سے لے کر جنوبی امریکہ تک پھیلا تین ہزار میل کا علاقہ جس میں تین درجن سے زیادہ جزائر پر مشتمل ممالک ہیں،ان جزائر کی مشترکہ کرکٹ ٹیم اور مرکزی کرکٹ بورڈ ہے۔تاجِ برطانیہ نے اپنے زیراثر جزائر کو ملا کر ویسٹ انڈیز کے نام سے 1960 میں ایک ریاست تشکیل دی تھی،مگر برطانوی نوآبادیاتی عہد کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی اور بعدازاں اس ملک سے کئی نئے ممالک بن گئے،مگر اس کا تشکیل دیا ہوا کرکٹ بورڈ آج بھی قائم ہے،ویسٹ انڈیز کی مشترکہ کرکٹ ٹیم ہمیں نصف صدی پہلے بکھر جانے والی ریاست کی یاد بھی دلاتی ہے۔اس کا کرکٹ بورڈ اور کرکٹ ٹیم ابھی تک بھرپور انداز میں قائم ہے۔چار جزائر یہاں اب بھی برطانیہ کے قبضے میں ہیں۔فرانس اور ہسپانیہ کے بھی بہت سارے جزائر تھے، بلکہ سب سے پہلے تو یہاں ہسپانوی ہی لنگر انداز ہوئے تھے۔

کرسٹوفر کولمبس جس نے امریکہ دریافت کر کے دائمی شہرت پائی ،وہ پہلے 1492 میں

ویسٹ انڈیز کے جزیرے بھاماس پر ہی لنگر انداز ہوا تھا۔ جب امریکہ کی دریافت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد ریاست ہائے متحدہ امریکہ نہیں ہوتا، کولمبس وہ پہلا یورپی باشندہ تھا جس نے امریکی براعظم پر قدم رکھے، اور یہ زمین ویسٹ انڈیز کی تھی۔ یہاں یہ تذکرہ کرتا چلوں کہ کولمبس کا تعلق سپین سے تھا۔ برطانیہ اور فرانس کے بعد ولندیزی اور ڈنمارک کے مہم جو اس سرزمین پر پہنچے تھے۔ ڈنمارک نے اپنے زیر تسلط جزائر 1916 میں پچیس ملین ڈالر کے قلیل سرمائے کے عوض امریکہ بہادر کو فروخت کر دیئے تھے۔ جنہیں اب بھی ہم ورجن آئی لینڈ کے نام سے پہچانتے ہیں۔ ہم سے نسبت یوں بھی خصوصی ہے کہ یورپ کے لوگوں نے ایسٹ انڈیا کے جنوبی ایشیاء میں واقع جزائر اور ہندوستان سے تفریق پیدا کرنے کے لئے امریکہ کے ان جزائر کو ویسٹ انڈیز کا نام دیا تھا۔ ویسے اس خطے کو کریبیا اور کریبین بھی کہا جاتا ہے۔ سرسبز جزیروں کا جھرمٹ۔

صبح کا سورج پاناما میں دیکھا اور شام ہونے کو تھی جب کرکٹ کے مرکز ترینی داد اور ٹوباگو پہنچا۔ پاکستان کے لوگ یہاں بغیر ویزے کے آجا سکتے ہیں۔ ائیر پورٹ پر امیگریشن عملہ بڑے دوستانہ انداز میں پیش آتا ہے۔ میرے خیال میں چند منٹ سے زیادہ وقت سوال و جواب میں نہیں لگا اور میرے پاکستانی پاسپورٹ پر انہوں نے اپنے ملک کی انٹری کا ٹھپہ لگا دیا تھا۔ لوگوں سے گلی، بازاروں میں بات کرنا بہت آسان ہے۔ برطانوی نوآبادیاتی ہونے کے سبب سبھی لوگ انگریزی میں بات کرتے ہیں اور ہر شخص کرکٹ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ جس کے ساتھ بات کرنے کا بہانہ نہ مل رہا ہو اس سے بے دھڑک کرکٹ پر بات شروع کر دیں۔ مکالمہ شروع ہو جائے گا۔ ابھی ابھی ایک بوڑھا مجھ سے حنیف محمد اور حفیظ کاردار کی تعریف کر رہا تھا، ماجد خان کے کیریئر کا بھی جائزہ اس نے تفصیلی پیش کیا، حالانکہ یہ میری پیدائش سے پہلے کے واقعات ہیں، مگر میں نے بوڑھے کا دل نہیں توڑا اور دلچسپی سے باتیں سنتا رہا۔

ایک لطیفہ نما واقعہ یہ ہوا کہ، میری میزبان کے چرب زبان خاوند سے جب کرکٹ کے موضوع پر بات ہو رہی تھی تو اس نے بتایا کہ میرے ہوٹل کے پچھواڑے پہاڑی پر برائن لارا کا گھر ہے۔ میں نے اسے سچ سچ بتا دیا کہ میں لارا کو بہت پسند کرتا ہوں۔ برائن لارا جیسے بلے باز دہائیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ میری بات کو سن کر کولن نامی یہ تازہ دوست کمال بے نیازی سے کہنے لگا

کہ اگر ایسی بات ہے تو میں تمہاری اس سے ملاقات کروادیتا ہوں۔ظاہر ہے، میں نے فوراً ہی آما دگی ظاہر کردی۔کولن کہنے لگا کہ آج تو دیر ہوگئی ہے،کل شام چھ بجے تیار رہنا۔اگلے روز وقت مقررہ پر میں تیار ہو چکا تھا اور وہ بھی عین وقت کیمطابق مجھے لینے کے لیے ہوٹل کی لابی میں پہنچ گیا۔گاڑی کی اگلی نشست پر میں اس کے برابر بیٹھا اور ایک، دومنٹ بعد ہی ہم پچھلی سڑک کے کنارے واقع پہاڑی کی چوٹی پر برائن لارا کے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔گھر کیا تھا، بالکل قلعہ نما تھا۔ اپنے لاہور کے گورنر ہاؤس سے ملتی جلتی عمارت ہے۔کولن نامی یہ باتونی شاہ کالا بتانے لگا کہ برائن لارا اکثر یہاں پارٹی کرتا رہتا ہے اور اس کی پارٹی میں شرکت کی داخلہ فیس عموماً سات، آٹھ سوڈالر ہوتی ہے۔مگر جتنے اچھے انتظامات اور انواع واقسام کے مشروبات پیش کیے جاتے ہیں۔یہ سا ت، آٹھ سوڈالر بھی زیادہ محسوس نہیں ہوتے ہیں۔اتنے میں سیکیورٹی گارڈ کی گیٹ کے ساتھ نصب سپیکر سے آواز برآمد ہوئی کہ کیا چاہیے؟ کولن نے گول مول سی بات کی اور فوراً ہی گیٹ کھل گیا، گارڈ برآمد ہوا تو اس کے ساتھ نہ جانے کیا گٹ مٹ ہوئی، وہ ہم دونوں کو گھر کے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ابھی ہم دونوں صوفے پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک باکسر ٹائپ نوجوان، سیاہ سوٹ، ٹائی میں ملبوس عقبی دروازے سے برآمد ہوا اور ہم سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا کہ کیسے آنا ہوا؟

میری میزبان کا خاوند اس سے مخاطب ہوا کہ جناب! میرے ساتھ جو صاحب تشریف لا ئے ہیں یہ سچن ٹنڈولکر کے کزن ہیں، اور برائن لارا سے ملنا چاہتے ہیں۔سوٹ میں ملبوس آدمی نے کہا کہ میں لارا کا منیجر ہوں، وہ اس وقت تو گھر پر نہیں ہیں، اگر ہوتے تو آپ سے مل کر بے حد خوشی محسوس کرتے مگر انہوں نے آپ کی آمد کا ذکر نہیں کیا؟ میں گنگ بیٹھا، حیرت اور پریشانی کے ملے، جلے جذبات کے ساتھ کوئی مناسب جواب ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کولن نے اپنی قینچی جیسی زبان چلائی، کہ دراصل یہ برائن لارا کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔منیجر کہنے لگا کہ میں آپ کی ملا قا ت کا وقت طے کر دیتا ہوں، آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟ کافی پی کر جایئے گا۔اس دوران میں کولن سے آنکھوں ہی آنکھوں میں التجائیں کر رہا تھا کہ ''نکلو یہاں سے'' کافی کی دعوت میں نے فوراً ہی رد کرتے ہوئے کہا کہ ابھی میں کچھ دن یہاں قیام کروں گا۔ہم دوبارہ حاضر ہوں گے، پھر آپ سے کافی پیئں گے، یہ ادھار رہا۔تقریباً گھسیٹتے ہوئے میں نے کولن کو صوفے سے اٹھایا اور تیز

قدموں کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئے ۔ باہر نکلتے ہی میں نے اس کی کلاس لینا شروع کر دی ۔ کولن کہنے لگا یار ! تمہاری شکل تو سچن ٹنڈولکر سے بہت ملتی ہے ، اور سچن ٹنڈولکر کا برائن لارا بڑا گہرا دوست ہے یقین کروا گر وہ مل جاتا تو ہماری بڑی خاطر مدارت کرتا۔

ویسٹ انڈیز میں برصغیر پاک وہند اور افریقی نسل کے والدین کے باہمی امتزاج سے پیدا ہونے والی اولاد کو ''دوغلا'' کہتے ہیں۔ترینی داداور ٹوباگو کی آبادی کا یہ دس فیصد ہیں۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہونے والوں کی تعداد آبادی کا 35 فیصد ہے اور یہی شرح افریقی نسل کے لوگوں کی ہے۔ دیگر نسلوں کے لوگ بیس فیصد ہوں گے۔ ویسٹ انڈیز کے زیادہ تر ممالک میں یہی شرح اور تناسب پایا جاتا ہے۔لفظ ''دوغلا'' سن کر پہلی بار تو مجھے جھٹکا لگا۔ یقیناً ہماری ثقافت میں یہ ایک منفی اظہار یہ ہے مگر جب میری ڈرائیور لینیٹ نے اپنے شوہر کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے مجھے بتایا کہ یہ میرا ''دوغلا'' ہے چونکہ ان کے والدین ہندوستانی اور افریقی مکس نسل کے ہیں تو میرے نزدیک اس لفظ کے معنی ہی بدل گئے ۔ یہاں کا مقبول میوزک ''چٹنی'' ہے یہ وہ گیت ہے جس کا سازینہ اور گانے کا انداز تو برصغیر کی موسیقی جیسا ہے، ترنم اور سرُ اردو گانول جیسا مگر بول انگریزی کے ہوتے ہیں۔ افریقی روایتی موسیقی ''سوکا'' بھی یہاں مقبول ہے اور آجکل چٹنی اور سوکا میوزک کا فیوژن بہت ہٹ چل رہا ہے۔

بس ڈرائیور کے تین بچے

پاکستانی نژاد برطانوی رکن پارلیمان ساجد جاوید کو وزیراعظم ٹریزا ے نے برطانیہ کا نیا وزیر داخلہ مقرر کیا ہے۔ وہ اس سے پہلے خزانہ اور کئی دیگر محکموں کے بھی وزیر رہ چکے ہیں۔ مستعفی ہونے والی وزیر داخلہ امبر رڈ کا قصہ بھی خاصا دلچسپ ہے، مگر اس وقت میں نئے مقرر کیے گئے داخلہ امور کے وزیر ساجد جاوید کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی وزارت کی اہمیت کے متعلق سر سری ذکر کرتا چلوں کہ خفیہ ایجنسی ایم آئی فائیو، ہوم آفس، امیگریشن کا محکمہ، اس کے علاوہ انگلینڈ اور ویلز کی پولیس بھی وزیر داخلہ کے ماتحت کام کرتی ہے۔ موجودہ برٹش وزیراعظم بھی پہلے وزیر داخلہ تھیں۔ نصف صدی قبل جب پنجاب کے علاقے ساہیوال سے ساجد جاوید کے والد ترک وطن کر کے بسلسلہ روزگار برطانیہ پہنچے تو ایک طویل عرصے تک وہ وہاں بس ڈرائیوری کرتے رہے۔ گرچہ میری نظر میں برطانیہ میں بسنے والے پاکستانیوں کی غالب اکثریت لیبر پارٹی کی حمایت کرتی ہے مگر وزیر موصوف کے والد مارگریٹ تھیچر سے متاثر ہو کر ٹوری پارٹی میں آ گئے۔ قدامت پرست جماعت کنزرویٹو پارٹی کو اہل برطانیہ ٹوری پارٹی کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کی وجہ مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ ان کی اس تبدیلی کے ساتھ ہی پاکستانی رواج کے مطابق بچوں کا بھی اسی طرف رجحان بن گیا۔

ان کی والدہ کا تذکرہ بھی کرتا چلوں، 1969ء میں ساجد جاوید کی پیدائش ہوئی، اس سے پہلے اور بعد بھی ان کی والدہ کپڑوں کا اسٹال لگایا کرتی تھی۔ حالانکہ وہ پانچ بہن بھائی تھے۔ انگلینڈ

میں اسٹال سے مراد کوئی فینسی دکان مت سمجھ لیجئے گا۔ یہ بالکل ویسا ہی منظر ہوتا ہے جسے پاکستان میں بازاروں کے اردگرد فٹ پاتھ پر لگے اسٹالوں کا نظر آتا ہے۔ بہت مشقت والا کام ہے بالخصوص جب موسم خراب ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں یہ سوال کلبلا رہا ہے کہ ایسے محنت کش والدین کا کوئی بچہ کیا پاکستان میں بھی وزیر داخلہ بن سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں، تو پھر اس کی وجہ کیا ہے؟ نظامِ حکومت تو ہمارے ہاں بھی وہی ہے جو برطانیہ عظمیٰ میں رائج ہے۔ پارلیمانی طرزِ جمہوریت۔ ایک اور پاکستانی بس ڈرائیور کا بیٹا صادق خان آج کل لندن شہر کا میئر ہے ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا وجہ ہے کہ ایک پاکستانی بس ڈرائیور کا بیٹا لندن کا میئر تو بن سکتا ہے مگر لاہور کا میئر بننے کا بس ڈرئیور کا بچہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہماری جمہوری اور آمرانہ حکومتیں ایک ہی صف میں کھڑی نظر آئیں گی اس باب کے اندر۔ پاکستان میں حکمران طبقہ اور محنت کش طبقہ الگ الگ ہے۔

ایچی سن کالج لاہور کے سابق پرنسپل نے ایک بار کہا تھا کہ چاہے جو بھی حکومت بن جائے۔ کابینہ کے آدھے سے زائد اراکین میرے کالج کے فارغ التحصیل طلبہ ہی ہوں گے۔ بات تو موصوف نے سچ کہی مگر یہ کوئی قابل فخر بات نہیں ہے، قابل افسوس اور لمحہ فکریہ ہے۔ پاکستان کو اس حال تک پہنچانے کے ذمہ دار مذکورہ پرنسپل کے نا خلف طلباء ہی ہیں۔ کابینہ کی بات چلی ہے تو مجھے برطانوی دارالامراء اور کابینہ کی پہلی مسلمان خاتون رکن سعیدہ وارثی یاد آ گئی ہے۔ اتفاق ایسا ہے کہ پاکستانی نژاد اس خاتون کے والد محترم بھی بس ڈرائیور تھے۔ یاد رہے کہ سعیدہ وارثی برونس ہیں اور حکمران ٹوری پارٹی کی سربراہ بھی رہی ہیں۔ کیا پاکستان میں کوئی بس ڈرائیور یا اس کی بیٹی یہ خواب بھی دیکھ سکتی ہے کہ وہ کبھی حکمران جماعت کی سربراہ بنے یا پھر کابینہ کی معزز رکن؟

ظاہر ہے یہ سب موجودہ حالت میں ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اگر پاکستانی بس ڈرائیوروں کے بچے برطانیہ میں جا کر اعلیٰ ترین حکومتی عہدوں پر پہنچ سکتے ہیں تو یہ پاک سرزمین پر بھی ممکن ہے۔ برطانیہ تو پرایا دیس ہے، پاکستان تو ان محنت کشوں کا اپنا دیس ہے۔ اپنی دھرتی پر تو ہونہار بچوں کی ترقی کا سفر اور زیادہ آسان ہونا چاہیئے۔ پچھلے دنوں سابق برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون کو ساجد جاوید کے بارے میں یہ کہتے سنا گیا کہ وہ برطانیہ عظمیٰ کے وزیراعظم

بنانے کے قابل ہیں۔عین ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں وہ یا کسی اور محنت کش پاکستانی کا بچہ برطانیہ کا وزیر اعظم بن جائے ،سوال مگر یہ ہے کہ ہمارے اپنے ملک میں ایسا ممکن کیوں نہیں؟ کیا وجہ ہے کہ کسی مزدور، کسان ،مزارع ،دھوبی ، نائی ،قصائی ، تیلی ،موچی کا بچہ ہمارے ملک میں ایوان اقتدار میں داخل نہیں ہوسکتا؟ حکمران اشرافیہ جتنی بھی مضبوط ہے،مگر ووٹ کی پرچی تو انہیں ہم اور آپ ہی دیتے ہیں ۔مقتدر حلقوں سے شکوے، شکایات اپنی جگہ وزن رکھتے ہیں مگر ہم عوام بھی تو اپنی سوچ کی سمت درست کریں ،اپنے جیسے لوگوں کو منتخب کر کے اقتدار سونپ کر دیکھیں ،اگر پاکستانی بس ڈرائیور کا بیٹا مئیر کی حیثیت سے دنیا کے اقتصادی مرکز لندن کا نظام چلا سکتا ہے تو پھر لاہور کا نظم ونسق بھی کسی محنت کش کے باصلاحیت بچے کو چلانے کا موقع دے کر تو دیکھیں ،انشاءاللہ بہتری آئے گی ۔ پاکستانی بس ڈرائیور کی بیٹی اگر برطانوی حکمران جماعت کو کامیابی سے چلا سکتی ہے تو پاکستانی سیاست میں بھی ایسا ممکن ہے۔پاکستان میں عام انتخابات کی آمد آمد ہے مسائل زدہ لوگوں کے مسائل تبھی حل ہوں گے جب وہ اپنے طبقے کے اندر سے قیادت فراہم کریں گے۔اگر برطانیہ جیسے سات سمندر پار ملک میں پاکستانی محنت کشوں کے بچے اچھی قیادت فراہم کر سکتے ہیں تو پھر پاکستان میں کیوں نہیں؟ یقیناً ایسا ممکن ہے۔محنت کش کی اصل نمائندگی محنت کش ہی کر سکتا ہے،کوئی جاگیردار یا سرمایہ دار ایسا نہیں کر سکتا۔

دوبئ کی ایک جھلک

عرب کی گرمی یوں تو ضرب المثل ہے مگر میرا تاثر یہی تھا کہ سورج غروب ہونے کے بعد یہاں بھی پاکستان کی طرح درجہ حرارت میں کمی آجاتی ہوگی، مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ رات کے گیا رہ بجے 38 ڈگری کی گرم ہوا چل رہی تھی، سوچا کہ صبح صادق کے وقت موسم خوشگوار ہوگا، مگر عین فجر کے وقت بھی دوبئ میں اس گرم درجہ حرارت میں کوئی کمی دیکھنے میں نہیں آتی۔ غسل کرنے کے لیے پانی کا نل کھولا تو گرم ابلتا ہوا پانی بہنے لگا۔ مجھے لگا کہ شاید میں نے غلط ٹونٹی کھول دی ہے، غور کیا تو پتا چلا کہ دائیں ہاتھ کی نیلی ٹونٹی ہی تھی، تھوڑا انتظار کیا کہ تھوڑی دیر میں ٹھنڈا پانی آنے لگے گا، مگر طویل انتظار کے بعد جب دائیں، بائیں کی دونوں نلکوں میں ایک جیسا گرم پانی رواں، دواں رہا تو میں نے ہوٹل کے استقبالیہ پر فون کیا کہ جناب! میرے کمرے کے غسل خانہ کے دونوں نلکوں میں گیزر کا پانی آرہا ہے۔ استقبالیہ نے بڑا حیران کن انکشاف کیا کہ یا حبیبی! ہمارے ہوٹل میں تو سرے سے گیزر کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ مزید یہ کہ ہوٹل ہذا کے نلکوں میں بہنے والے پانی کا بلند درجہ حرارت ہی متحدہ عرب امارات میں بہنے والے قدرتی پانی کا مروجہ ٹمپریچر ہے۔ ساتھ ہی تجویز دی کہ نہانے سے پہلے ٹب میں پانی ٹھنڈا ہونے کے لیے کچھ وقت کے لئے رکھ چھوڑیں۔ میں سوچنے لگا کہ آج تو پھر بھی یہاں جدید زندگی کی سہولیات، ائیر کنڈیشنر اور فریج سے گرمی کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے، مگر صدیوں پہلے لوگ یہاں کیسے زندگی بسر کرتے ہوں گے؟ یقیناً بہت سخت جان اور جفاکش باشندے ہوتے ہوں گے۔

خلیج فارس کی چھوٹی سی ریاست دوبئ یوں تو متحدہ عرب امارات کی سات ریاستوں میں سے ایک ہے مگر عالمی سطح پر ملک کی سب سے مقبول ریاست ہے۔ یوں تو ابوظہبی معاشی اور قدرتی وسائل کے اعتبار سے سب سے آگے ہے، علاوہ ازیں، اسے متحدہ عرب امارات کا دارالحکومت ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے، مگر دنیا بھر کے سیاحوں اور صحرانوردوں میں دوبئ کی مقبولیت ابوظہبی کی نسبت زیادہ ہے۔ تیس لاکھ آبادی اور پندرہ سو مربع میل کے اس مختصر سے دیس میں غیر ملکیوں کی دلچسپی کی بڑی وجہ شاپنگ کے علاوہ یہاں کی حکومت کی سیاحت کو فروغ دینے کی انتھک کوششیں ہیں۔ دنیا کی بلند ترین عمارت برجِ خلیفہ یقیناً دیدہ زیب ہے اور پام جمیرا کا بھی دنیا میں کوئی ثانی نہیں مگر اصل چیز جو سیاحوں کو دوبئ میں کھینچ کر لاتی ہے وہ یہاں کا پر سکون ماحول، قانون کی بالادستی، تحفظ کا احساس اور حکام کا دوستانہ رویہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ واقفانِ حال میرے ''دوستانہ رویہ'' کے تاثر سے متفق نہ ہوں، مگر یہ بات تو وہ بھی مانیں گے کہ دوبئ کے لوگ عربوں میں سب سے کم بدتمیز ہیں۔ ہاں! مغرور تو سبھی عرب ہوتے ہیں، کچھ نہ کچھ مسائل تو ہیں، تبھی ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اسی صحرائے عرب میں اللہ تعالی نے اتارے۔

دوبئ کی آبادی کا تین چوتھائی حصہ انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی لوگ یہاں ہم سے دوگنا زیادہ ہوں گے اور بنگالیوں کی آبادی ہم سے تین گنا کم ہے۔ مقامی عرب مجموعی آبادی کا فقط بیس فیصد حصہ ہیں۔ ان کی شناخت کو غیر ملکیوں سے کوئی خطرہ نہیں چونکہ غیر ملکی افراد کو یہ اپنے ملک کی شہریت دیتے ہیں اور نہ ہی مستقل رہائش کی اجازت، سبھی تارکین وطن یہاں ''اقامہ'' پر ہی مقیم ہوتے ہیں۔ جیسے سعودی عرب میں ''کفیل'' بڑی خوفناک چیز ہوتا ہے، یہاں پر ''ارباب'' وہی کردار نبھاتا ہے مگر ذرا کم خوفناک اور قدرے زیادہ مہذب ہوتا ہے۔ ریاست کا واحد شہر بھی دوبئ ہی ہے، باقی آبادی چھوٹے چھوٹے قصبات اور دیہات پر مشتمل ہے۔ زیادہ تر حصہ لق ودق صحرا پر مشتمل ہے جہاں اب بھی اکثر ریت کے طوفان آتے ہیں ،سمندری طوفان ان ریت کے طوفانوں کے سامنے ہیں۔

عام تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ دوبئ کی اس چمک، دمک اور رنگارنگی کا اصل سبب تیل کی برآمد سے حاصل ہونے والی دولت ہے۔ یہ تاثر بالکل غلط ہے۔ دوبئ کی آمدنی میں تیل سے حاصل ہو

نے والا حصہ پانچ فیصد سے بھی کم ہے۔تجارتی اور کاروباری خدمات کے ساتھ ساتھ سیاحت کا شعبہ ہے جو قومی پیداوار کا غالب حصہ ہے۔دوبئ کے حکمران خاندان،خصوصا مرحوم حکمران راشد المکتوم نے ایک دانشمندی ضرور کی کہ تیل سے حاصل ہونے والی دولت کو فضول کاموں میں ضائع کرنے کی بجائے ملک کا انفراسٹرکچر بنانے میں صرف کیا۔بہتر تجارتی پالیسی،سرمایہ کاری کے لیے دوستانہ ماحول اور جدید شہری سہولیات وہ عناصر تھے جنہوں نے دنیا بھر کے سرمایہ کاروں کو دوبئ کی جانب متوجہ کیا۔بینکاری کے شعبہ میں غیر معمولی آسانیوں اور رعایتوں نے اسے دنیا بھر میں ایک اہم معاشی مرکز بنا دیا ہے۔جزیرۃ العرب میں جدید طرز زندگی اور روایتی اسلامی تمدن کا ایسا مثالی امتزاج کہیں اور نہیں ملتا جیسا دوبئ میں نظر آتا ہے۔

دوبئ کی وجہ تسمیہ کی کہانی بھی قوس قزح کے رنگوں جیسی رنگ برنگی ہے۔اس بابت آدھ درجن روایات میں نے بھی سن رکھی ہیں۔جن میں سے معتبر ترین بازار کی نسبت سے اور دوسری روایات عربی ضرب المثل ''دبا دبئ'' سے مشتق ہے،زمانہ قدیم سے ہی یہ چونکہ معمولی بندرگاہ کا علاقہ شمار ہوتا تھا،اسی سبب سے یہاں سے عرب کے دیگر ممالک میں جانے والوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ''دبا دبئ''یعنی یہ مال کے ساتھ آئے ہیں،یا مالدار ہیں۔ایک اور روایت جو بظاہر توضعیف سنائی دیتی ہے مگر دلچسپ ہے۔دوبئ کا مصدر دو بھائی بیان کیا جاتا ہے۔زمانہ قدیم میں اس بندرگاہ پر دو بھائیوں کی طویل عرصہ تک اجارہ داری قائم تھی۔یہ دو بھائی بحری جہازوں کو ایندھن مہیا کرنے کے علاوہ تجارت بھی کرتے اور اپنی خدمات کے عوض راہداری وصول کرتے تھے۔انہی دو بھائیوں کی نسبت سے یہ بندرگاہ ''دو بھائی'' کہلانے لگی جو بعد ازاں ''دوبئ'' بن گیا۔۔اب متحدہ ارب امارات میں یہ شامل سب سے کثیر الآبادریاست ہے،علاوہ ازیں ابوظہبی کے علاوہ یہ یواے ای کی واحد ریاست ہے جسے ویٹو پاور حاصل ہے۔بنوامیہ کے دور میں جب اسے مسلمانوں نے فتح کیا

تو یہ لوگ ایرانیوں کی طرح آتش پرست تھے، مگر یہ تذکرہ پھر کبھی کریں گے۔

متحدہ عرب امارات کا پاکستان سنٹر

دوبئی کا پاکستان سنٹر دیکھ کر ذہن میں ماضی کے لاہور کا گوئٹے انسٹیٹیوٹ، برٹش کونسل اور امریکن سنٹر ابھرتا ہے۔ پاکستان سنٹر ان تمام مذکورہ اداروں سے زیادہ کشادہ، متنوع اور کئی لحاظ سے بہتر ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ادارہ متحدہ عرب امارات میں مقیم پاکستانیوں نے اپنی مدد آپ کے تحت ایک ایک اینٹ اکٹھی کر کے تعمیر کیا ہے۔ اس کے عظیم الشان آڈیٹوریم میں ایک ہزار افراد با آسانی سما سکتے ہیں۔ بوقت ضرورت اسے ٹینس اور باسکٹ بال کے میدان میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ جدید ترین ساؤنڈ سسٹم اور سٹیج سے مزین یہ ہال پاکستانی تارکین وطن کی اکثر تقریبات کا اب مرکز ہے۔ آڈیٹوریم کے سامنے جدید طبی سہولیات سے آراستہ میڈیکل کیئر سنٹر اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ اس اسپتال میں متحدہ عرب امارات میں مقیم مستحق پاکستانیوں کا مفت علاج کیا جائے گا۔ خوبصورت مسجد، اور بحالی مرکز بھی اس منصوبے کا اہم حصہ ہیں۔ مگر جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ پاکستان سنٹر میں قائم اردو لائبریری ہے۔ نیا زمسلم لائبریری کے نام سے قائم یہ کتب خانہ مشرق وسطی میں اردو کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ لائبریرین خاتون صائمہ ریاض نے جدید خطوط پر قائم اس لائبریری کا ہمیں تفصیلی تعارف کروایا اور اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ وہ اس ادارے کو مشرق وسطی میں اردو کتب کا ایک مثالی مرکز بنانا چاہتی ہیں، ایک ایسی اردو لائبریری جہاں بیٹھ کر آپ کو پاکستان کی مہک آئے۔ اس کشادہ لائبریری میں بہت اعلی معیار کے ادبی اجتماع بھی منعقد ہوتے ہیں۔ میرے میزبان شاعر دوست

امجد اقبال امجد نے بتایا کہ پچھلے دنوں بھی پاکستانی شعراء کو یہاں مدعو کا گیا تھا۔ پاکستان کے تقریبا تمام نامور شعراء اس لائبریری میں اپنا کلام سنا چکے ہیں۔ مہمانوں کی کتاب میں اپنے تاثرات درج کرنے کے بعد میں نے بھی اپنے اشعار پیش کیے۔ یہ باتیں میں اس لیے تحریر کر رہا ہوں کہ پاکستان سے باہر پاکستانیوں کا قائم کردہ ایسا خوبصورت ادارہ میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھا، گرچہ میں درجنوں ممالک گھوم چکا ہوں۔

پاکستان ایسوسی ایشن دوبئ کے زیر انتظام پاکستان سنٹر میں داخل ہوں تو سامنے قائداعظم، علامہ اقبال اور مقامی حکمرانوں کی تصاویر کے ساتھ پاکستانی پرچم دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اس ادارے کا استقبالیہ اعلی معیار کے بین الاقوامی نجی اداروں جیسا ہیں۔ جس میں انتظار گاہ ایسی خوبصورت ہے کہ دل چاہتا ہے گھنٹوں کتابوں اور پاکستانی رسالوں کا یہاں بیٹھ کر مطالعہ کیا جائے، جو کہ انتظامیہ نے چہار اطراف شیلف میں اردو قارئین کے لیے سجا رکھے ہیں۔ سفارت خانے کا اسٹاف تو کسی بھی ملک کا ہو، اور کہیں بھی متعین ہو، عموما افسرانہ مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ اکثر اہلکار متکبرانہ انداز میں بات کرتے اور ملتے ہیں۔ تمام لوگوں سے ایک فاصلہ رکھ کر ملنا شاید ان کی تربیت اور غیر دوستانہ رویہ دنیا بھر کے سفارتی عملے کا خاصہ شمار ہوتا ہے۔ تارکینِ وطن پاکستانی اور ان کے قائم کردہ ادارے مجھے اس لیے بھی بہت اچھے لگتے ہیں کیونکہ وہ پاکستان کی دیار غیر میں ایک خوبصورت تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ دوبئ میں گیارہ پاکستانی اسکول قائم ہیں۔ عمومی معیاری تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ سارے ادارے پاکستانی ثقافت کے فروغ کے لیے بھرپور انداز میں کام کر رہے ہیں۔ میں ان تمام اداروں کا دورہ تو نہیں کر سکا مگر تہہ دل سے ان کا مشکور ہوں کیونکہ یہ میرے ملک کی زبان پڑھا رہے ہیں۔ میری ثقافت کو فروغ دے رہے ہیں۔ سچ پوچھیں تو میں ان کو پاکستان کا حقیقی سفیر سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک سر دھاتھ کی

تین انگلیوں سے ڈھیلا سا مصافحہ کرنے والا ایمبیسی کا افسر میرے ملک کا اصل نمائندہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہم لوگ تو بڑی گرمجوشی سے ملنے والے، محبت کرنے والے لوگ ہیں۔اسی محبت کا اظہار پاکستان ایسوسی ایشن کے ادبی فورم کا میرے اعزاز میں دوبئ کے گرینڈ حیات ہوٹل میں ایک شعری نشست کا انعقاد تھا۔عصر تا مغرب یہ محفل شاندار اور یادگار تھی۔معتبر اور نوآموز شعراء کرام کا ڈھیر سارا کلام سننے کا موقع ملا، تارکین وطن کی شاعری کے موضوعات عموماً دیس میں بسنے والے شعراء کرام سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔منطقی سی بات ہے کہ ان کے گرد پیش کا ماحول چونکہ پردیس کا ہوتا ہے۔رمضان المبارک کی نسبت سے شاعر دوستوں نے حمد اور نعت کے شعر بھی پیش کیے۔ عید کرنے کے لیے مجھے پاکستان پہنچنا تھا اس لیے گرینڈ حیات ہوٹل کی تقریب سے سیدھا ایئر پورٹ روانہ ہو گیا مگر دوبئ کے پاکستان سنٹر کی خوبصورت یادیں میرے ساتھ رہیں گی۔قارئین کرام، اور بالخصوص اہل قلم پاکستانیوں سے یہ درخواست ہے کہ اگر ممکن ہو تو پاکستانی زبانوں کی کتب تحفتاً دوبئ کے پاکستان سنٹر میں قائم نیاز مسلم لائبریری کو ارسال کریں۔ بہت سے قارئین کے لیے شاید یہ بات انکشاف کا درجہ رکھتی ہو کہ یو اے ای میں اردو قومی زبان کا درجہ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ستر لاکھ کی کل آبادی میں پندرہ لاکھ پاکستانی اور اٹھارہ لاکھ ہندوستانی اردو بولتے ہیں، بہت سے مقامی عرب نہ صرف اردو بولتے اور لکھتے ہیں بلکہ کئی صاحبِ دیوان شاعر بھی ہیں۔ ڈاکٹر فاروق کے تو پچاس سے زائد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔آج کا متحدہ عرب امارات پاکستانی تارکین وطن کے لیے وطن سے دور وطن کی خوشبو کی عملی تصویر پیش کر رہا ہے۔

نیا امریکی صدر اور امن کی امیدیں

ایک طویل انتخابی معرکے کے بعد جو بائیڈن نے 46 ویں امریکی صدر کا حلف اٹھا لیا ہے۔عمومی طور پر امریکہ میں انتخابی عمل اور اس کے بعد انتقالِ اقتدار کا مرحلہ اتنا کٹھن اور دشوار گزار نہیں ہوتا۔اس بار مگر وائیٹ ہاؤس کے باسی کا نام ڈونلڈ ٹرمپ تھا۔اس نے جاتے جاتے بھی نئی تاریخ اس طرح سے رقم کی کہ انتخابی نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو کہ امریکی روایات کے برعکس بات تھی۔یہی نہیں بلکہ اس سے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے مسلح جتھے کی مدد سے نظامِ حکومت کو یرغمال بنانے کی کوشش کی گرچہ ناکام رہا۔اسی لئے اسے بے عزت کر کے نکالا گیا،یعنی رخصتی سے ایک ہفتہ قبل اس کا مواخذہ کیا گیا۔عمومی امریکی مزاج ہے کہ وہ اپنے صدر کی تذلیل نہیں کرتے۔سربراہ مملکت ہونے کے ناطے نا صرف اسے ہر طرح کی عدالتی کاروائی سے استثنٰی حاصل ہوتا ہے بلکہ عوام بھی اس کی توہین نہیں کرتے۔یقین کیجئے جس طرح کی کمنٹری اور تنقید ہم اپنے سربراہان مملکت کے متعلق کرتے آئے ہیں امریکی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

صدر ٹرمپ امریکی تاریخ کا متنازعہ ترین صدر گزرا ہے۔مغرور، بدتمیز، بدلحاظ،نسلی تعصب رکھنے کے علاوہ بھی بے پناہ خامیوں کا مالک تھا۔شاید اسی لئے حالیہ انتخابات میں ناکامی سے دوچار ہوا۔ورنہ امریکہ میں کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی صدر دوسری مرتبہ کی مدت کے لئے منتخب نہ ہو۔جب سے صدارت کا منصب قائم ہوا،یعنی 1789 میں صدر جارج واشنگٹن کی آٹھ سالہ مدت صدارت سے لے کر باراک اوباما کی دو الیکشن جیت کر آٹھ سالہ صدارتی عہدے کی معیاد تک یہ

روایت نظر آتی ہے۔ جارج بش سینئر کے علاوہ حالیہ تاریخ میں دوسرا نام ٹرمپ کا ہے جو دوسری چار سالہ مدت کے لئے منتخب نہ ہو سکا۔ مگر ایک بات غور طلب ہے ہمارے لئے، کہ ڈونلڈ ٹرمپ کے جارحانہ ذاتی رویے کے باوجود اس کے دور حکومت میں امریکہ بیرون ملک کسی بھی جنگ میں نہیں الجھا۔ صدر ٹرمپ بڑبولا ضرور تھا مگر اس کے عہد میں سمندر پار سے امریکی فوجیں واپس ضرور آئی ہیں مگر کسی نئے محاذ پر نہیں بھیجی گئیں۔

جن دنوں عراق جنگ کے عروج کا زمانہ تھا۔ نائین الیون ہو چکا تھا اور میں نیویارک میں جائے حادثہ دیکھنے گیا تھا۔ اس دہشت گردی کے واقعے نے پوری دنیا کو ہمیشہ کے لئے تبدیل کر کے رکھ دیا۔ نیویارک کے زیر زمین ریلوے اسٹیشن پر مسافر اپنی اپنی ٹرین کے انتظار میں کھڑے تھے۔ امریکہ میں زیر زمین ریل کے نظام کو سب وے کہا جاتا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے سب وے اسٹیشن پلیٹ فارم پر میں کوئینز کو جانے والی ٹرین کا منتظر تھا، یہاں ایک امریکی بزرگ سے گپ شپ ہونے لگی۔ وہ عراق میں امریکی فوج بھیجنے کے سخت مخالف تھا۔ اس بڈھے کا استدلال مگر منفرد تھا اور قائل کر لینے والا۔ بزرگوار کا کہنا تھا کہ ہر ملک کے اپنے مسائل اور مشکلات ہوتی ہیں۔ ہر ریاست کو چاہئیے اپنے درپیش اندرونی مسائل پر توجہ مرکوز کر کے انہیں حل کرنے کی کوشش کرے۔ امریکہ کو اپنے داخلی معاملات پر توجہ دینی چاہیے اور عالمی پولیس مین کا کردار اپنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہی سوچ اور عمومی رویہ امریکی عوام کی غالب اکثریت کا ہے۔ یعنی ان کی حکومت کو داخلی امور پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے اور خارجی معاملات میں زیادہ نہیں الجھنا چاہئیے۔ مقامی لوگوں کے نزدیک امریکہ بذات خود ایک مکمل دنیا ہے، اسے نہ عالمی مسائل پر زیادہ فکر مند ہونا چاہئیے اور نہ ہی اپنی اندرونی الجھنوں و دیگر مسائل کے متعلق بیرونی دنیا کا کوئی اثر قبول کرنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کچھ قارئین کو الگ تھلگ رہنے کے اس استدلال میں کسی حد تک خود غرضی بھی نظر آئے مگر حقیقت یہی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ہمیں پسند آئے، یا پھر نا پسند ہو، امریکہ میں جو لوگ جنگوں کے خلاف احتجاج بھی کرتے ہیں تو ان میں سے اگر اکثریت نہیں تو بڑی تعداد امن پسندوں کی نہیں بلکہ اس نقطہ نظر کی حامی ہوتی ہے کہ ہمیں اپنے کام سے کام رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ احتجاجی جنگ کے فلسفے یا امن کی آشا کے سبب ہی اکٹھے نہیں

ہوتے، بہت سے ان میں اس لئے بھی سراپا احتجاج نظر آتے ہیں کہ ''سانوں کیہ؟'' ہمیں اس بیرونی معاملے میں الجھ کر قیمتی امریکی جانیں ضائع نہیں کرنی چاہئیں۔

حیرت انگیز طور پر امریکی عوام کی بیرونی دنیا کے متعلق معلومات انتہائی کم ہیں، بلکہ اگر کہا جائے کہ ظالمانہ حد تک ناقص ہیں تو بھی جھوٹ نہیں ہوگا۔ سب وے کا ابھی تذکرہ کر رہا تھا، ایک دفعہ سب وے اسٹیشن پر کھڑی فربہ نیگرو خاتون نے ٹرین کے انتظار میں، اپنا فضول وقت گزارنے کے لئے میرا حال احوال پوچھنے کے بعد میرے ملک کی بابت سوال کیا۔ پاکستان کا نام سن کر کہنے لگی کہ اچھا ہوا تم جنگ شروع ہونے سے پہلے پہلے ہی امریکہ آ گئے۔ وہاں تو ہڑبونگ مچا ہوا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب افغانستان پر امریکہ نے حملہ شروع کیا تھا، تورا بورا کی تاریخی بمباری اور طالبان کے خلاف فضائی اور زمینی آپریشن جاری تھا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس نیک بخت کو افغانستان اور پاکستان کا فرق بھی معلوم نہیں تھا۔ مگر آپ زیادہ حیرت زدہ مت ہوں کہ عمومی عالمی معلومات کا امریکی سماج میں یہی حال ہے۔ دنیا سے الگ تھلگ اور اپنے آپ میں گم رہنے کا تصور ہی غالب سماجی رویہ ہے۔ مگر امریکی صنعتوں اور معاشرے کو توانائی کے حصول کے لئے بیرونی دنیا، بالخصوص مشرق وسطیٰ پر انحصار کرنا پڑ تا رہا ہے۔

چونکہ دنیا میں تیل کی مجموعی پیداوار کا تقریباً تیس فیصد امریکہ استعمال کرتا ہے۔ یہ صورتحال آنے والے دنوں میں یکسر تبدیل ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ جس کی وجہ تیل نکالنے کی نئی ٹیکنالوجی ہے۔ اس شیل ٹیکنالوجی کے بروئے کار آنے کے بعد امریکہ سادہ الفاظ میں بیرونی دنیا سے تیل درآمد کرنے کا محتاج نہیں رہا۔ گزشتہ نصف صدی میں برپا ہونے والی زیادہ تر امریکی جنگوں کا موجب و محرک یہ تیل بیان کیا جاتا ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ تیل کی عالمی قیمت پچھلے سات آٹھ سال میں مسلسل گزشتہ پچاس برسوں کے مقابلے میں انتہائی کم رہی ہے۔۔ اس کی وجہ یہی تیل زمین سے نکالنے کی نئی ٹیکنالوجی ہے جس کی بدولت زیرزمین جا بجا بکھرا ہوا تیل جو پہلے نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ اب اسے نکالا اور استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ طریقہ ذرا مہنگا مگر انتہائی کارگر ہے۔ اسی کے طفیل اب امریکہ، سعودی عرب اور ایران کے تیل کا موازنہ اپنے ذخائر سے کر رہا ہے اور تیل برآمد کرنے والا ملک بن گیا ہے۔

امریکی جنگوں کے سب سے بڑے موجب تیل اور کیمونسٹ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد بظاہر امریکہ کے کسی نئی جنگ کا حصہ بننے کے امکانات بڑے محدود نظر آتے ہیں۔چین اور سوویت یونین کے کیمونزم میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ چین اپنا نظام معیشت یا کوئی بھی نظریہ ایکسپورٹ کرنے کا خواہش مند نہیں ہے۔اس کی ساری توجہ معیشت پر ہی مرکوز ہے۔اسی لئے میرے خیال میں جو بائیڈن کے دورِ حکومت میں معیشت کے میدان میں تو جھڑپیں ہوتی رہیں گی۔مگر عسکری محاذوں پر امریکہ شاید کسی نئے معرکے کا حصہ نہیں بنے گا۔امید کی جاسکتی ہے کہ نئے امریکی صدر کا عہد امن کا دور کہلائے گا۔

صنفی برابری میں پاکستان کی حالت

ورلڈ اکنامک فورم ایک معتبر خودمختار ادارہ ہے ۔معیشت کے شعبے میں عالمی سطح پر نجی اور سرکاری شعبوں کے باہمی تعاون کا فروغ اس ادارے کا بنیادی مقصد بیان کیا جاتا ہے۔مختلف معاشی موضوعات پر اپنے تحقیقی مقالہ جات کے علاوہ مشاہیر کو اپنی تقریبات ،مباحثوں، میں شریک رکھنے کے سبب یہ ادارہ اکثر خبروں کا موضوع رہتا ہے۔اس مرتبہ موضوع بحث اس ادارے کی جاری کردہ صنفی امتیاز کے متعلق ایک سالانہ رپورٹ ہے جسے ''گلوبل جینڈر گیپ'' کا نام دیا گیا ہے۔میں اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال کرنے سے حتی الامکان پرہیز کرتا ہوں مگر کہیں کہیں یہ آج کل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کو دنیا میں دستیاب مواقع اس طرح جانچے گئے ہیں کہ ان کی بنیاد پر اس عالم رنگ و بو کے تمام ممالک کی ایک فہرست بنا دی گئی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اس صنفی برابری کی فہرست میں شامل 149 ممالک میں پاکستان کو 148 ویں نمبر پر رکھا گیا ہے۔مختلف موضوعات پر عالمی اداروں کی اس طرح کی رپورٹیں آتی رہتی ہیں، اکثر نظر انداز بھی کر دی جاتی ہیں،مگر یہ رپورٹ میرا موضوعِ سخن یوں بنی کی صدر عارف علوی نے اپنے سرکاری ٹویٹر اکاؤنٹ سے اس موضوع پر اظہار خیال فرمایا ہے،اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے اور انتظامیہ، مقنّنہ کے ساتھ ساتھ عدلیہ سے بھی اس صورتحال کا نوٹس لینے کے لئے کہا ہے۔

صنفی برابری کی عالمی درجہ بندی جسے ورلڈ اکنامک فورم نے یوں ترتیب دیا ہے، کہ اس

فہرست میں میرے ملک کا حال یمن سے قدرے بہتر ہے،مگر باقی دنیا کے مقابلے میں بدتر قرار دیا گیا ہے،اس کی بنیاد چار شعبہ ہائے زندگی ہیں،سیاست،معیشت،صحت اور تعلیم۔خواتین کی نمائندگی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔سیاست کے شعبے میں حاصل اختیارات کو غالباً بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے،شاید یہی وجہ ہے کہ بنگلہ دیش میں اس رپورٹ کے مطابق حالات امریکہ اور روس سے بہت بہتر ہیں۔چونکہ بنگلہ دیش کا نمبر 48واں ہے،جبکہ امریکہ اکیاون ویں نمبر پر ہے اور روس 75ویں نمبر پر جگہ بنا سکا ہے۔اقتصادی مواقع کی جنس یا صنف کی بنیاد پر تفریق کی بات کریں تو پھر سری لنکا چین سے بہتر دکھایا گیا ہے اور ہندوستان کہیں 108ویں نمبر پر ہے۔صحت اور تعلیم کے شعبہ جات بھی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے جانچے گئے ہیں۔جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے،جو کہ اس سالانہ صنفی برابری کی عالمی درجہ بندی رپورٹ میں شائع ہوا ہے۔

میں اس رپوٹ کے معتبر ہونے یا غیر معتبر ہونے پر استدلال نہیں دوں گا،جس میں افریقہ کا فاقہ زدہ ملک چھٹے نمبر پر ہے اور جاپان 110ویں نمبر پر ہے،باالفاظ دیگر جاپان کو روانڈا کا مقام حاصل کرنا ہے تو اسے کئی دہائیاں اور سخت محنت کرنا درکار ہوگی۔جاپان کی پوزیشن پچھلے سال سے چار درجے بہتر ہوئی ہے۔چونکہ وہ 114ویں نمبر پر تھا بقول 2017 رپورٹ۔عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی رپورٹ جس میں روانڈا،نمیبیا،نکاراگوا اور بنگلہ دیش دنیا کے معاشی وعسکری لحاظ سے مضبوط ترین ممالک امریکہ،چین،جاپان اور روس سے بہت آگے ہوں گے،بلکہ آئیڈیل نظر آرہے ہوں،G8 ممالک کے لئے مشعل راہ ہوں،اس طرح کی کسی فہرست کے متعلق ہم سے زیادہ دوسری اقوام کو فکر کرنی چاہئے۔ہمیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ہماری پریشانی کا سبب دیگر موضوعات ہونے چاہئیں،ان میں سرفہرست معیشت ہے جو کہ مسلسل گراوٹ کا شکار ہے۔پاکستان کی شرح نمو بڑی تیزی سے نیچے گر رہی ہے،روپے کی تاریخی بے قدری ہو رہی ہے۔بے روزگاری اور مہنگائی روشنی کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ان باتوں کا نوٹس لینے کی ضرورت ہے اور وہ بھی فوری طور پر۔ورلڈ اکنامک فورم کے سوئٹزرلینڈ میں بیٹھے بیوروکریٹ ٹائپ ملازمین جو اپنی تنخواہیں کھری کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ چھاپتے رہتے ہیں،وہ

پاکستان اور اس کے حقیقی مسائل کو پاکستانیوں سے بہتر نہیں جانتے ہیں ،اور نہ ہی جان سکتے ہیں۔ان کے قائم کردہ معیارات پر پورا اترنا ہمارا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔

اسلام کی ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ ہے اور ساٹھ ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں، مگر یہ اعزاز ہمارے وطن پاکستان کا ہے کہ اس نے اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک خاتون محترمہ بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم منتخب کیا تھا۔اسلامی دنیا میں عرب ،ایران کی بات ہی نہیں، ترکی ،ملائشیا،انڈونیشیا جیسے ممالک سیاسی ،سماجی اور معاشی اعتبار سے قدرے جدید ممالک میں بھی آتے ہیں،مگر صنفی برابری کی سیاست اور سماج میں مثال قائم کرنا پاکستانی قوم کا اعزاز ہے۔جبکہ امریکہ جیسی سپر پاور ریاست میں آج تک کوئی خاتون ملک کی سربراہ منتخب نہیں ہوسکی ہے۔گزشتہ امریکی انتخابات میں بڑی مشکل سے ہیلری کلنٹن صدارتی امیدوار بن پائیں،مگر آج ڈونلڈ ٹرمپ صرف اس بنیاد پر امریکی صدر منتخب ہوا بیٹھا ہے چونکہ اس ملک کی عوام ایک عورت کو صدر نہیں بنانا چاہتے تھے۔خواتین کے متعلق پاکستانیوں کا عمومی رویہ تکریم کا ہے۔سماج میں جنسی تفریق اور صنفی امتیاز بلاشبہ ایک اہم مسئلہ ہے۔مگر غربت اور بے روزگاری زیادہ اہم معاملہ ہے۔چونکہ یہ عورت اور مرد دونوں کا مسئلہ ہے۔آخر میں صدر مملکت سے دست بستہ گزارش ہے کہ صدر پاکستان کے سرکاری ٹوئیٹر ہینڈل سے اس طرح کے پیغامات آپ کے منصب کی توہین ہیں۔آپ نے جو عدالتِ عالیہ سے ورلڈ اکنامک فورم کی رپورٹ کا نوٹس لینے کا کہا ہے وہ کسی طور پر جائز نہیں ہے۔ایسی خبروں کا نوٹس لینا عدالتِ عظمیٰ کا کام نہیں ہے۔عدالت کے ذمے اس سے زیادہ ضروری کام ہے اور وہ کام خلقِ خدا کو انصاف کی فراہمی ہے۔

اس بلا سے نجات ممکن ہے

چند دن پہلے فلپائن کے ساحل پر ایک وہیل مچھلی مردہ حالت میں پہنچی۔ملحقہ شہر میں قائم مقامی میوزیم کے اہلکاروں نے سب سے پہلے اس واقعے کی اطلاع ذرائع ابلاغ کو پہنچائی،اور وہیل مچھلی کو اپنے قبضے میں لے لیا۔عجائب گھر کی انتظامیہ نے متعلقہ شعبے کے کو بھی ریسرچ کے لئے فوری طور پر مدعو کیا۔محققین نے اس مچھلی کے پوسٹ مارٹم کے بعد جو اس کی موت کی وجہ بیان کی وہ کافی پریشان کن ہے۔مردہ وہیل کے جسم کے اندر سے چالیس کلوگرام پلاسٹک شاپنگ بیگ ملے ہیں جنہیں عرف عام میں شاپر کہا جاتا ہے،یہی شاپر ممکنہ طور پر اس مچھلی کی موت کا سبب بنے ہیں۔گرچہ بلحاظ حجم وہیل مچھلی اس کرہ ارض میں پائی جانے والی مخلوقات میں سب سے بڑی ہوتی ہے ۔مگر پھر بھی ایک من پلاسٹک بیگ کی اس کے معدے میں موجودگی بہت سارے سنجیدہ سوالات کو جنم دیتی ہے۔یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ پلاسٹک شاپنگ بیگ کسی وہیل مچھلی کی موت کا سبب بنے ہوں۔ماہرین کے مطابق گزشتہ برس بھی ایک وہیل مچھلی اس وجہ سے ہلاک ہوگئی تھی کہ اس کے جسم کے اندر 80 شاپر چلے گئے تھے۔

سمندر میں بڑھتی ہوئی پلاسٹک کی مقدار بے حد سنجیدہ مسئلہ بن چکی ہے۔ماحولیاتی آلودگی زمین پر آباد تمام جانداروں کے لئے جان لیوا معاملہ بنتی جارہی ہے۔اس ضمن میں پلاسٹک بیگ یوں دردسر بن رہے ہیں کہ یہ صدیوں تک یوں کے توں دھرتی ساگر میں موجود رہتے ہیں، گلنے سڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔نہ ہی مٹی میں ملتے ہیں اور نہ ہی پانی میں حل ہوتے ہیں۔اگر ہم اپنے

کوڑے دان کا جائزہ لیں تو اس میں موجود اشیاء کی واضح اکثریت چند سالوں میں مٹی یا پانی میں حل ہو جاتی ہے۔ بہت سارا کوڑا کرکٹ تو زمین کی زرخیزی کا سبب بھی بنتا ہے۔ فضلہ وغیرہ کھاد کا کام کرتا ہے۔ آپ یہ جان کر شاید حیران ہوں گے اور ممکن ہے کہ پریشان بھی ہو جائیں، کہ پلاسٹک بیگ کو گلنے سڑنے اور حل ہونے میں ایک ہزار سال تک کا عرصہ لگ سکتا ہے۔

جی ہاں! پلاسٹک بوتل یا شاپر ممکنہ طور پر ایک ہزار سال کے طویل عرصہ تک زمین پر آلودگی کا سبب بن سکتے ہیں۔ پلاسٹک بوتل یا دیگر اشیاء کو گلنے سڑنے کے لئے یوں تو پلاسٹک شاپنگ بیگ سے بھی زیادہ وقت درکار ہے، مگر یہ چھوٹا مسئلہ اس لئے ہے کہ عمومی طور پر پلاسٹک کی دیگر اشیاء بار بار استعمال ہوتی ہیں، بوتلیں ری سائیکل کر لی جاتی ہیں، جبکہ شاپر صرف ایک مرتبہ استعمال ہو کر ہماری زمین میں آلودگی کا حصہ بن جاتے ہیں، وہ بھی ایک انتہائی طویل مدت کے لئے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پلاسٹک بیگ سے عملی طور پر نجات ممکن ہے؟ جی ہاں! بالکل ممکن ہے۔ اس بارے میں آپ کو ایک تازہ مثال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میرا برسوں سے لاطینی امریکہ میں بالعموم اور چلی میں بالخصوص آنا جانا رہتا ہے۔ کئی سال تک وہاں قیام پذیر بھی رہا۔ اس نئے سال کی ابتدا کے ساتھ ہی چلی کی حکومت نے پلاسٹک شاپنگ بیگ پر پابندی عائد کر دی۔ اس بیان کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہم عملی طور پر ان مسائل سے کیسے نمٹیں گے جو شاپر پر پابندی کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس کے بہت عادی ہو گئے ہیں۔ نیز یہ سوال بھی اہم ہے کہ اس پابندی پر عمل درآمد یقینی کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ اس بابت چلی کی حکومت نے پہلا قدم تو یہ اٹھایا کہ تمام بڑے شاپنگ سینٹرز اور سپر سٹورز کو پابند کر دیا کہ وہ پلاسٹک بیگ استعمال نہیں کریں گے، شاپر میں سودا بیچنا ممنوع قرار دے دیا گیا، متبادل کے طور پر کپڑے اور پولیسٹر کے تھیلے قیمتاً فروخت ہونے لگے ہیں۔ گھر کا سودا سلف لانے کے لئے ایک بار خریدا ہوا کپڑے کا تھیلا بار بار استعمال ہوتا رہتا ہے، ظاہر ہے ہر بار خریداری کرتے وقت آپ نیا تھیلا نہیں خریدیں گے، چونکہ بہرحال پیسے ضائع ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے شاپنگ پر نکلتے وقت چلی میں اب لوگ تھیلا ساتھ لے جانے لگے ہیں۔ جیسا کہ شاپر کی منحوس ایجاد سے پہلے ہمیشہ ہوتا تھا۔ میرے خیال میں ماحول کے تحفظ کی یہ بہت ہی تھوڑی قیمت ہے جو ہمیں بخوشی ادا کرنی چاہیے۔

آپ اندازہ لگائیں کہ ہمارے پورے ملک میں ایک دن میں کتنے پلاسٹک بیگ استعمال ہوتے ہیں،اور پھر ہر روز یہ کیسے آلودگی میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمیں پلاسٹک شاپنگ بیگ کی عادت اپنائے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔میری مرحومہ پھوپھی یہ شکوہ کیا کرتی تھیں کہ جب سے یہ نا ہنجار شاپر آئے ہیں چیزوں سے برکت ہی اٹھ گئی ہے۔جیسے شاپر تیز ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں،ویسے ہی ان میں لایا گیا سودا سلف بھی غتر بود ہوجاتا ہے،فوراً ہی غائب ہوجاتا ہے،ہوا میں اڑ جاتا ہے۔دارلحکومت سنتیا گو میں شاپنگ مال سے ایک جیکٹ خریدی تو کیشئر نے مجھ سے سوال پوچھا کہ کیا آپ کپڑے کا تھیلا خریدنا پسند کریں گے؟میں نے سوچا صرف جیکٹ ہی تو ہے ہاتھ میں پکڑ کر پیدل نکلا تو محسوس کیا کہ اکثر لوگ سودا سلف ہاتھ میں پکڑے ہی لے جارہے تھے،اور وہ سب کچھ پہلے سے ہی پیک شدہ ہوتا ہے۔

جاپان میں شاپر کے استعمال میں کمی کے لئے شاپنگ سنٹرز شاپر کی قیمت الگ سے وصول کرنے لگے ہیں تاکہ لوگ کم سے کم پلاسٹک بیگ میں اپنا سامان لے جانے کی کوشش کریں۔عہد ساز صحافی منوّ بھائی اکثر ایک افریقی ضرب المثل دہرایا کرتے تھے،کہ یہ زمین ہم نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں نہیں پائی بلکہ یہ دھرتی آنے والی نسلوں کی ہمارے پاس امانت ہے۔گزشتہ برس برطانوی حکومت یہ چشم کشا رپورٹ شائع کی ہے کہ آنے والے دس برسوں میں سمندر میں پلاسٹک کی مقدار آج کے مقابلے میں تین گنا مزید بڑھنے کا اندیشہ ہے،اگر اس بارے میں کوئی فوری اور سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا گیا۔

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

ذہن میں گزشتہ ہفتے سے ایک تصویر چپک کر رہ گئی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے تین بزرگ پروفیسر ہتھکڑیاں پہنے پریشانی کے عالم میں، پولیس کے حصار اندر نیب کی عدالت میں پیش ہونے جا رہے ہیں۔ میں ان اساتذہ کرام کے نام ونسب اور ان پر عائد کئے گئے الزامات کی تفصیل سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ بس اتنا پتہ چلا ہے کہ ان کی گرفتاری بدعنوانی کے الزام میں ہوئی ہے۔ حلیے سے ان سب پروفیسر حضرات کی عمریں ستر سال کے پیٹے میں لگ رہی ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں چھڑی ہے اور دیگر کے بارے میں بھی یہی معلومات سامنے آئی ہیں کہ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ چلنے، پھرنے میں دقت کا سامنا نظر آرہا ہے۔ اس کے باوجود ایک بزرگ ونحیف استاد کو دو پولیس والوں نے بازوؤں سے پکڑ رکھا ہے، جیسے ان کے دوڑ بھاگنے کا قوی امکان ہو۔ مجھے بزرگ اساتذہ کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر بہت شرمندگی ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر باضمیر پاکستانی جس نے مذکورہ تصویر یا اس متعلق ویڈیو کلپ دیکھا ہے، اس کے یہی جذبات ہوں گے۔

اساتذہ کرام کو اس طرح بے عزت کرنے کا نیب کے سربراہ اور اعلیٰ حکام کے پاس ضرور کوئی جواز موجود ہوگا، عرض یہ ہے کہ نیب کے پاس جتنے بھی مضبوط دلائل ہوں مگر معلمین کی اس طرح سے تذلیل کے مناظر نے روح کو گھائل کر کے رکھ دیا ہے۔ جیسی شکلیں زنجیروں میں قید قوم کے ان بدقسمت معماروں کی ہیں، یہ قطعاً مجرم نہیں لگتے۔ مگر قانون تو اندھا ہوتا ہے، وہ شکل دیکھ کر

فیصلے نہیں کرتا ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ ایسے مناظر دیکھ کر پاکستان کے لئے سنہرے مستقبل کے خواب دیکھنے والی آنکھوں کو مایوسی ہوتی ہے۔جو اہلِ دل ہیں ان کے دل ٹوٹتے ہیں۔ذہن میں مایوسی کے جالے پھیلنے لگتے ہیں۔جب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مجاہد کامران کو ہتھکڑی میں گھسیٹ کر پولیس والے نیب کے حضور پیش کرنے جاتے ہیں۔برسہابرس برصغیر پاک و ہند کی پہلی اور جدید یونیورسٹی ،جو کہ بقول منو بھائی عالم اسلام کی سب سے بڑی درس گاہ بھی ہے،اس کے سربراہ تھوڑی سی عزت وتوقیر کے مستحق ٹھہرائے جانے چاہئیں۔نیم خواندہ پولیس اہلکاروں سے تو کوئی شکوہ ہی نہیں ہے جو انہیں زنجیروں میں کھینچ رہے ہیں کہ ان بے چاروں کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ مصنف ہونے کا مطلب کیا ہے،مجاہد کامران نے کتنی کتابیں لکھی ہیں اس بات سے ان سیکیورٹی اہلکاروں کا کیا واسطہ،پولیس حکام ہمارے ہاں کتاب بینی سے ذرا دور ہی رہتے ہیں۔نیب کے اعلیٰ حکام کو تو یقیناً اندازہ ہوگا کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ سرگودھا یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ہتھکڑیاں لگواتے وقت ان کی تعلیمی قابلیت اور تدریسی اہلیت وحوالہ تو انہیں یقیناً معلوم ہوگا۔

اساتذہ کرام کی یہ تذلیل میری طرح بہت سے لوگوں کو ذاتی توہین محسوس ہوتی ہے۔گرچہ میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن پاس کی مگر ان دنوں ہمارا کالج پنجاب یونیورسٹی کے ہی زیرانتظام تھا،ہمیں جو ڈگری جاری ہوئی وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی جانب سے ہی منظور کردہ ہے۔بھلا جس وائس چانسلر کی اپنی کوئی عزت نہ ہو،اس کے دستخط سے جاری ہونے والی ڈگری کی کیا عزت ہے؟ کیا حیثیت ہے اس کے جاری کردہ تعلیمی سرٹیفکیٹ کی جس استاد کی اپنی کوئی حیثیت معاشرے میں نہیں؟ جو اقوام اپنے اساتذہ کی عزت نہیں کرتیں ہیں،تاریخ بتاتی ہے کہ ان کا مقدر دنیا میں تذلیل کے سوا کچھ نہیں ہوا کرتا۔زمانے میں ترقی کرنے والی قومیں ایسی غلیظ حرکتیں نہیں کرتی ہیں۔یہ منظر نامہ دیکھ کر تو اندیشہ دامن گیر ہونے لگتا ہے کہ ہمارا قومی سفر شاید ترقی کی جانب نہیں بلکہ ترقی معکوس کی سمت رواں دواں ہے۔

روشن مستقبل کی امید اور سنہرے دنوں کے خواب دیکھنا اچھی بات ہے،مگر ہمارے زمینی حقائق متضاد سمت میں جاتے دکھائی دیتے ہیں۔مثبت سوچ رکھنا قابل ستائش اور مثبت رویہ

ہے۔لیکن تلخ حقائق سے منہ موڑنا جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ پرانے پاکستان میں تو استاد کو روحانی باپ سمجھا جاتا تھا۔یہ کیسا نیا پاکستان بن رہا ہے؟ پروفیسرز اور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز، درجنوں کتابوں کے مصنّفین اساتذہ کرام زنجیروں اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ذلیل وخوار ہوتے پھر رہے ہیں۔آنے والے دنوں کا سوچ کر ڈر لگتا ہے۔کوچہ و بازار کا منظر زیادہ حوصلہ افزاء نہیں ہے۔قانون سب کے لئے برابر ہونا چاہئے ۔ ہر مجرم کو اس کے کئے کی سزا ضرور ملنی چاہئے۔ظلم یہ ہے کہ آج کل سزا پہلے دی جاتی ہے اور مقدمے کی شنوائی بعد میں ہوتی ہے۔کل کو اگر متذکرہ مقدمہ میں اساتذہ کرام باعزت بری بھی ہو جائیں تو کیا ان کی کھوئی ہوئی عزت واپس آ جائے گی؟ان کے ماتھے سے تذلیل کے داغ دھل جائیں گے؟ کیا سرِ عام ہونے والی اس توہین کا کوئی مداوا ممکن ہے؟

بھارت کا اقتصادی مستقبل اور پاکستان

معاشی اعتبار سے دنیا کی بڑی سرکردہ بیس طاقتوں کی نمائندہ تنظیم جی ٹونٹی (G20) کا سربراہ اجلاس جاپان کے شہر اوساکا میں منعقد ہوا۔ ایسے اجلاس عمومی طور پر کوئی انقلابی فیصلے نہیں کیا کرتے، بلکہ نشستن، گفتن، برخاستن کی عملی تفسیر ہوا کرتے ہیں۔ یہ دوروزہ اجلاس بھی اسی قسم کا تھا۔ البتہ دنیا کی انیس بڑی قوتوں اور یورپی یونین کے نمائندے کی آمد سے خوب رونق لگ جاتی ہے۔ یہی کچھ جاپان میں پہلی مرتبہ انعقاد پذیر ہونے والے G20 کے اس چودھویں سربراہ اجلاس میں بھی ہوا۔ ٹرمپ سے لیکر پیوتن اور برطانوی تھریسا مے سے لے کر طیب اردوان اجلاس میں نظر آئے۔ سعودی شہزادہ محمد بن سلمان نے اپنے ملک کی نمائندگی کی تو انڈونیشیا اور چین کے صدور بھی وہاں موجود تھے۔ ہندوستان کے وزیراعظم نریندر مودی تازہ تازہ الیکشن جیت کر آئے تھے اور کامیابی پر مبارکبادیں وصول کرتے رہے۔

امریکی صدر کی بیٹی دختر اول کی حیثیت سے ہر جگہ ٹرمپ کے ساتھ نظر آئی۔ ایوانکا ٹرمپ مختلف سربراہان مملکت سے کاروبار ریاست اور دیگر عالمی دلچسپی کے موضوعات پر گپ شپ کرتی نظر آئیں، ایوانکا کے اس کردار پر امریکہ سمیت دنیا بھر کے میڈیا میں کافی تنقید بھی ہوئی کہ یہ غیر سفارتی رویہ ہے۔ مگر ڈونلڈ ٹرمپ چونکہ غیر روایتی آدمی ہیں، اس لئے بقول شخصے بیٹی نے ضد کر دی کہ ابو! ابو!! میں نے بھی جانا ہے، اور پہلی لائن میں بیٹھنا ہے، لہٰذا امریکی صدر اسے ساتھ لے کر جی ٹونٹی اجلاس میں آ گئے۔

مذاق برطرف لگتا یہ ہے کہ امریکی صدر کی بیٹی ان کی مشیر کے طور پر کام کر رہی ہیں، جیسا کہ ایوانکا کے یہودی عقیدہ رکھنے والے خاوند نامدار وائیٹ ہاؤس میں اقامت پذیر ہیں اور بطور مشیرِ خاص صدر پر کافی اثر رکھتے ہیں۔ میں تشویش میں مبتلا اس وقت ہوا جب میں نے ایوانکا ٹرمپ کو اجلاس کے دوران نریندر مودی کی امریکی صدر سے ہونے والی ملاقات کی تفصیلات میڈیا کو بتاتے ہوئے سنا۔ بھارت اور امریکہ کے تعلقات کی گہرائی اور اہمیت کو جس گرمجوشی سے دختر اول بیان کر رہی تھیں وہ غیر معمولی تھی۔ پریشان کن یہ بات اس لئے بھی ہے کہ عین ممکن ہے ، بلکہ قرین قیاس یہی ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ بھی بھارت کے بارے میں ایسے ہی دوستانہ اور ہمدردانہ جذبات رکھتے ہوں گے۔ بھارت کی معاشی ترقی اور چین کے ساتھ اس کی تاریخی مخاصمت کے سبب امریکی محبت اور تعاون کا چشمہ جو کبھی ہماری طرف بہتا تھا اب اس کا رخ لگتا ہے ہندوستان کی طرف مڑ گیا ہے۔

بریگزٹ یعنی برطانیہ کا یورپی یونین سے الگ ہونے کا فیصلہ کئی برس سے گفتگو کا موضوع رہا ہے۔ اس سال خزاں میں بالآخر علیحدگی کا یہ عمل مکمل ہو جائے گا۔ اب تو ایک طرح سے یہ طے شدہ معاملہ ہے مگر اب بھی اس موضوع پر دنیا بھر میں سرکردہ افراد رائے زنی کر رہے ہیں کہ کیا یہ درست فیصلہ ہے؟ سابق برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر اس فیصلے سے ناخوش دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مستقبل میں ہمیں اس فیصلے پر پچھتانا پڑے گا۔ میرے لئے مگر اس انٹرویو میں حیرانگی کا پہلوان کا بھارت کے معاشی مستقبل کے بارے میں نقطہ نظر تھا۔ ٹونی بلیئر کا کہنا تھا کہ ہمیں آج سے تیس سال بعد کا سوچنا چاہئیے جب ہمارے پوتے ، پوتیاں ہمارے بچوں کی عمر کے ہو جائیں گے۔ تیس سال بعد دنیا میں تین بڑے معاشی دیو ہوں گے، امریکہ، چین اور انڈیا۔ ٹونی بلیئر اگر سرسری بات کر رہے ہوتے تو معاملہ دوسرا تھا۔ بریگزٹ کے موضوع پر ان کے بیانیے کا بنیادی نقطہ ہی یہ تھا کہ امریکہ اپنی عسکری قوت اور جغرافیہ کی وجہ سے اور آبادی و تنوع کے سبب تیس سال بعد بھی اہم ملک رہے گا جبکہ چین اور بھارت اپنی معاشی طاقت میں اس قدر اضافہ ہو جائے گا کہ دنیا بھر میں چوتھے نمبر کا ملک ان سے آدھی معیشت کا حامل بھی نہیں ہوگا۔ ان تین ممالک کے بعد درمیانے درجے کے ممالک آئیں گے۔ برطانیہ اور جرمنی جیسے ممالک درمیانے درجے کی

معیشت والے ممالک رہ جائیں گے۔وہ تو اس تناظر میں بات کر رہے تھے کہ یورپی یونین کے رکن کی حیثیت سے برطانیہ کے مفادات کا بہتر انداز میں تحفظ ہوسکتا ہے۔ہمارے لئے مگر الارم بجانے والی بات ان کی گفتگو کا یہ حصہ ہے کہ تیس سال بعد ہندوستان دنیا کی تین بڑی معاشی قوتوں میں سے ایک ہوگا۔ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہم معاشی میدان میں بھارت کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ کیونکہ ہم نہ تو اپنا جغرافیہ تبدیل کر سکتے ہیں اور نہ ہی جنگوں اور خراب تعلقات کی تاریخ بدل سکتے ہیں۔

اس وقت پاکستان کی معیشت شدید بحرانوں کا شکار نظر آتی ہے۔مجموعی قومی پیداوار سے لے کر شرح نمو تک،کرنسی کی شرح تبادلہ سے لے کر اسٹاک مارکیٹ کی گراوٹ تک کچھ بھی حوصلہ افزا دکھائی نہیں دیتا۔کچھ قرض،امداد مل گئے،مزید ملنے کی نوید وزیر خزانہ نے حال ہی میں سنائی ہے کہ راستہ ہموار ہو گیا ہے۔صورتحال مگر یہ ہے کہ اس سال یعنی 2019 میں سقوط ڈھاکہ کے بعد پہلی مرتبہ بنگلہ دیش کی مجموعی قومی پیداوار معیشت کا حجم (GDP) ہم سے بڑھ گیا ہے۔بات یہاں پر ختم نہیں ہو جاتی،تشویش ناک بات یہ ہے کہ معیشت کی شرح نمو یعنی بڑھوتری کی شرح ہماری اس سال تین فیصد جبکہ بنگلہ دیش کی سات فیصد ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنے والے سالوں میں بنگالی معیشت ہم سے اور زیادہ بڑی ہونے کا امکان ہے۔

جیسے جیسے بھارت کی معیشت کا حجم بڑھ رہا ہے۔اسی تناسب سے وہ جنگی ساز وسامان کی خریداری میں اضافہ کرتا چلا جا رہا ہے۔آج اس دنیا میں اسلحے کا سب سے بڑا خریدار ہندوستان ہے۔اگر آج وہ 140 جنگی جہازوں کا آرڈر دے رہا ہے تو یہ جدید لڑاکا طیارے اس کے اپنے ملک میں تو کسی کام نہیں آئیں گے۔سویلین آبادی کو کنٹرول کرنے میں تو ایسا اسلحہ استعمال نہیں ہوتا۔یقیناً اس کا حدف سرحد پار ہے۔غالب امکان یہی ہے کہ وہ حدف پاکستان ہے۔ہمارے خراب مالی حالات ہمیں اجازت ہی نہیں دے رہے کہ ہم دفاعی ضروریات بڑھا سکیں۔ہم تو ضروری اخراجات کم کرنے کے متعلق سوچ بچار کر رہے ہیں۔تیس سال بعد اگر واقعی بھارت اتنی بڑی معاشی طاقت بن گیا جیسی دنیا بھر میں پیشین گوئیاں ہو رہی ہیں تو کیا ہم موجودہ دفاعی صلاحیت کے ساتھ اس کا مقابلہ کر سکیں گے؟

اس ضمن میں چین کے ساتھ دوستی ہماری طاقت ہوسکتی ہے۔ بھارت اور چین کے درمیان جنگ، جس میں بھارت کو شکست ہوئی اور اس کا کچھ علاقہ بھی چین کے قبضے میں چلا گیا، ان دو ہمسایہ ممالک کے خوشگوار تعلقات میں رکاوٹ رہے گی۔ پاکستان اور چین کے پر اعتماد تعلقات اور بھارت سے مخالفت ایک مشترکہ نقطہ ہے۔ مگر کیا چین سے دوستی پاکستان کے دفاع کی ضمانت بن سکتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہمیں خود ہی اپنا دفاع اس قابل بنانا پڑے گا۔ اس بابت عہد ساز مصنف میکاولی اپنی شہرہ آفاق کتاب ''دی پرنس'' میں لکھتا ہے کہ کبھی کوئی غیر ملک آپ کے دفاع کی ضمانت نہیں بن سکتا، جس نے بھی اپنے دفاع کے لئے غیر ملکی قوت پر تکیہ کیا تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے ہمیشہ نقصان اٹھایا ہے۔ آج بھارت کی معیشت ہم سے دس گنا بڑی ہے جو کہ رقبے اور آبادی کے تناسب سے دیکھا جائے تو کسی حد تک قابل فہم ہے۔ مگر یہ معاشی فرق اگر مزید بڑھتا ہے تو اس کے شدید تر ویراتی اثرات ہوں گے۔

نگران حکمرانوں کا امتحان

چند روز بعد پاکستانی قوم اپنی تاریخ کے اہم ترین انتخابات میں ووٹ ڈالنے جارہی ہے۔ یہ عام انتخاب اس لحاظ سے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں کہ مسلسل دو جمہوری ادوار اپنی آئینی مدت پوری کر کے تیسری منتخب جمہوری حکومت قائم ہونے جارہی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ جب نو منتخب حکومت پاکستان کی ''پلاٹینیم جوبلی'' منارہی ہوگی تو ملک میں جمہوریت کی روایت مزید مضبوط ہو چکی ہوگی۔ فقط چند ہی دن 25 جولائی کے عام انتخابات میں باقی ہیں مگر ابھی تک بہت سارے خدشات اور اندیشے اس حوالے سے عوام میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا سوال جو لوگوں کے ذہن میں اٹھ رہا ہے وہ نگران حکومت کی غیر جانبداری کے متعلق ہے۔ کیا نگران حکمران شفاف، غیر جانبدارانہ، منصفانہ، اور آزادانہ الیکشن کروا سکیں گے؟ موجودہ انتخابات ایک طرف یہ نگران حکمرانوں کی صلاحیتوں اور غیر جانبداری کا بھی کڑا امتحان ہیں۔ تمام سیاسی جماعتوں کو اپنا پیغام پہنچانے اور نقل وحرکت کے برابر موقع فراہم کرنے میں اب تک یہ نگران حکومت کامیاب نظر نہیں آرہی ہے۔ واضح طور پر ہر صوبے میں ایک سیاسی گروہ محبوب اور باقی سیاسی جماعتیں معتوب نظر آتی ہیں۔

موجودہ ماحول میں ہونے والے عام انتخاب کے نتائج کو کیا عوام اور سیاسی قائدین تسلیم کر لیں گے؟ اگر ان انتخابات کے نتائج تسلیم نہ کیے گئے تو یقیناً معاملات احتجاج کی طرف جائیں گے۔ ایک طویل سیاسی عدم استحکام اور بے چینی۔ کیا ملکی معیشت ایسے سیاسی خلفشار کی متحمل ہو سکتی

ہے؟ امن وامان کی صورت حال جو پہلے ہی وگرگوں ہے مزید خراب ہوسکتی ہے۔ یہ پیش گوئی کر نے کے لیے آئین سٹائن کے دماغ کی ضرورت نہیں ہے کہ عام انتخابی نتائج کو مسترد کر دیں گے۔ اگر نگران حکمرانوں کے زیر نگرانی دھاندلی کی گئی تو پاکستان کو شدید نقصان ہوگا۔ ان نقصانات کی جہتیں اور شدت طے کرنا اس وقت شاید مشکل ہے اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے۔ طویل عدم استحکام اور سیاسی خلفشار دھاندلی زدہ الیکشن کی صورت میں دور تک جاتا نظر آتا ہے۔

گزشتہ انتخابات 2013ء کی نگران حکومت کی مثال ہمارے سامنے ہے، پنجاب کی بات کریں تو نگران وزیر اعلیٰ نجم سیٹھی کی تقرری سیاسی قیادت کی طرف سے بڑی حد تک متفقہ طور پر کی گئی تھی۔ پیپلز پارٹی نے ان کا نام تجویز کیا تھا، مسلم لیگ (ن) نے اس پر آمادگی ظاہر کی تھی اور عمران خان کے گھر جا کر نجم سیٹھی نے ان کا آشیر باد حاصل کر کے نگران وزارت اعلیٰ سنبھالی تھی۔ مگر ان عام انتخابات کے نتائج آئے تو آصف زرداری نے آر۔او۔ الیکشن کی صدا بلند کر دی اور عمران خان نے اس بابت ''35 پنکچر'' کو بنیاد بنا کر طویل احتجاج کیا اور دھرنا دیا۔ قابل تشویش با ت یہ ہے کہ اس مرتبہ تو ڈاکٹر حسن عسکری رضوی کی تقرری تو روز اول سے ہی متنازعہ ہے۔ ان پر جا نبداری کا الزام ہے۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) الیکشن سے قبل ہی ان پر دھاندلی کا الزام لگا رہے ہیں۔

نگران حکومت اور الیکشن کمیشن کا واحد مقصد شفاف اور آزادانہ ماحول میں منصفانہ طور پر عام انتخابات کا انعقاد ہے۔ ایک ایسی فضا جس میں نگران اداروں کی غیر جانبداری نظر آئے۔ یہ ان کا فرضِ منصبی ہے جس سے کسی طور پہلو تہی نہیں کرنی چاہیے، ورنہ تاریخ اور آئندہ آنے والی نسلیں انہیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔

پاک فوج کا عام انتخابات میں کردار متعین اور محدود ہے۔ پرامن فضا قائم کیے رکھنا، شر انگیزی اور تشدد کی صورت میں امن وامان کی بحالی۔ افواج پاکستان کی شبیہ ہر صورت حال میں سیا سی طور پر ایک غیر جانبدار ادارے کی ہونی چاہیے، پاکستانی قوم کے ایک مشترک اور غیر متنازعہ ادارے کے طور پر فوج کا یہ امیج اسی صورت میں قائم ہوگا، اگر پولنگ اسٹیشن پر وہ صرف اپنے آئینی کردار تک خود کو محدود رکھیں گے۔ پاکستانی فوج کسی ایک سیاسی جماعت یا کسی دوسرے سیاسی

دھڑے کی فوج نہیں ہے، یہ 22 کروڑ عوام کی فوج ہے۔جس طرح پاک سرزمین کا ہر گوشہ اس کے لیے پیارا ہے، جس کی حفاظت اس کا فرض ہے، بالکل اسی طرح پاکستان میں بسنے والا ہر شہری اس کے لیے برابر اور اس کی حفاظت فرض منصبی ہے، چاہے شہری کا تعلق کسی بھی سیاسی پارٹی سے ہو۔جمہوریت کوئی آئیڈیل نظام حکومت نہیں ہے۔اس میں بہت ساری خرابیاں پائی جاتی ہیں، مگر سینکڑوں سال کے انسانی سماج میں ارتقاء کے نتیجے میں سامنے آنے والے سیاسی نظاموں میں سے جمہوریت ہی سب سے بہتر ریاستی انتظام ہے جو کہ ستیاب ہے۔مستقبل میں ہوسکتا ہے دنیا میں جمہوریت سے زیادہ اچھا کوئی نظام حکومت دریافت ہو جائے، مگر حال کی گھڑی تک تو یہی طرز حکومت ہے جو تین ہزار سال کے انسانی ارتقاء نے سب سے بہتر تشکیل دیا ہے۔اس وقت دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ پچاس ممالک کی فہرست دیکھیں تو سب میں یہی نظام رائج نظر آتا ہے، ہماری ترقی بھی جمہوری طرز حکومت میں ہی ممکن ہے۔

پسِ تحریر:

الیکشن کمیشن آف پاکستان اپنی آئینی ذمہ داریاں نبھانے میں بری طرح ناکام رہا۔جانبداری، دھاندلی اور غیر منصفانہ رویے کے باعث 2018 کے الیکشن پاکستان کی تاریخ کے متنازعہ ترین الیکشن قرار پائے، ستم بالائے ستم الیکشن کے نتائج ترتیب دینے کے لئے جو نظام تشکیل دیا گیا تھا اور جسے RTS کا نام دیا گیا، الیکشن کی رات یہ RTS سسٹم مبینہ طور پر بیٹھ گیا۔

اساں دل نوں مرشد جان لیا

پنجابی اور اردو زبان کے مقبول شاعر، کالم نویس، مزاح نگار اور براڈ کاسٹر ابرار ندیم کا تازہ شعری مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ''اساں دل نوں مرشد جان لیا'' ان کے شعری سفر کا تیسرا پڑاؤ ہے۔ اس شعری مجموعے میں بھی ان کا منفرد اسلوب نمایاں ہے، وہ بھیڑ کے ساتھ چلنے والا تخلیق کار نہیں ہے اور نہ ہی شعر وسخن کی دنیا میں پائی جانے والی موضوعاتی بھیڑ چال کا قائل نظر آتا ہے۔ دو دہائیاں پہلے ابرار نے زمانہ طالب علمی میں ہماری پہلی ملاقات کے دوران یہ شعر سنایا تھا جو آج بھی یاد ہے کہ

چنگے طور طریقے چھڈ کے زہری ہندے جاندے نے
ہولی ہولی پنڈاں والے شہری ہندے جاندے نے

کمال یہ ہے کہ ابرار نے زندگی کا بیشتر حصہ شہر میں گزارنے کے باوجود خود پر شہر کا رنگ نہیں چڑھنے دیا۔ مضافاتی گرم جوشی اور خلوص آج بھی اس کی شخصیت کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ اچھا شاعر ہونا بلا شبہ ایک خوبی ہے مگر اچھا انسان ہونا میرے نزدیک اس سے بڑی اور بنیادی خوبی ہے۔ وقت اور تجربے نے یہ چیز سکھائی ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اچھا فنکار، اچھا انسان بھی ہو۔ فنکاروں کا فن اور شخصیت ایک ہی سمت میں ہمیشہ نہیں ہوتے ہیں۔ مگر ہونا تو ایسا ہی چاہیئے کہ ہم جس چیز کا پرچار کرتے ہیں وہ محاسن ہماری ذات کا بھی حصہ ہوں۔ ہم شاعر لوگ اپنی شاعری میں جس وفا کی طلب اور اعلیٰ اخلاقی رویوں کا تقاضا کرتے ہیں وہ خوبیاں ہماری شخصیت میں بھی

نظر آنی چاہئیں۔ابرارندیم کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس کا فن اور شخصیت ایک جیسے ہیں۔وہ جن اخلاقی خوبیوں کا سماج سے متمنی ہے خود ان کی عملی تفسیر بھی ہے۔اپنی شاعری کی طرح اجلا اجلا،نکھرا نکھرا،تصنع اور بناوٹ سے پاک۔

آج کل تصوف اور درویشی کے الفاظ کثرت استعمال کے سبب اپنے معنی ومطالب کھوتے جا رہے ہیں۔شعروسخن میں مگر آج بھی صوفیانہ رنگ اپنے اصلی گوڑھے رنگ میں نظر آتا ہے۔بلھے شاہؒ کے الفاظ میں

جو رنگ رنگیا، گوڑھا رنگیا

ابرارندیم کلاسیکی شاعری کی اسی خوبصورت روایت کا امین ہے جس میں عشق حقیقی کو مجاز کے پیراہن میں پیش کیا جاتا ہے۔سنا ہے کہ سنگ مرمر میں کوئی پودا نہیں اگ سکتا ماسوائے زیتون کے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ زیتون کی جڑیں اتنی باریک اور فائن ہوتی ہیں کہ سنگ مرمر کو احساس ہی نہیں ہوتا اور وہ اس کے اندر داخل ہو جاتی ہیں۔سنگ مرمر کے مسامی پتھر کے اندر جس طرح زیتون کی جڑیں داخل ہوتی ہیں، برصغیر میں صوفیاء کرام کی شاعری نے بھی وہی کام ہمارے دلوں کے ساتھ کیا ہے۔ابرارندیم کی شاعری بھی ایسی ہی شاعری ہے،دلوں میں گھر کر جانے والی۔ہم سنگ دل دنیاداروں کو انسانیت کا احساس دلانے والی۔

بیج اور کنکر میں بنیادی فرق جوشِ نمو کا ہے۔جو دھرتی کا سینہ چیر کر نکلے،وہ بیج ہے۔سچے تخلیق کار کی مثال بیج جیسی ہے۔جو نمو پا کر سماج کو سایہ اور پھل دیتا ہے۔جو فنکار معاشرے کو سایہ اور پھل فراہم نہ کر سکے وہ جوش نمو سے عاری کنکر کی مانند ہے۔استاد دامن نے شاعر کی بڑی خوبصورت تعریف کی ہے۔

میرے خیال اندر او شاعر ہندا
جیہڑا اکھنڈ نوں کھنڈ تے زہر نوں زہر آکھے
جیہڑا اندی نوں ندی تے نہر نوں نہر آکھے

''اساں دل نوں مرشد جان لیا'' کی شاعری استاد دامن کے قائم کردہ اس معیار پر حرف بہ حرف پوری اترتی ہے۔آزادی اظہار پر دن بدن بڑھتی ہوئی دیدہ ونادیدہ پابندیوں کے سبب

شاعری کا سکوپ مزید بڑھتا جا رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میرے پیر بھائی گلِ نوخیز اختر نے مجھ سے پوچھا کہ میں شاعری کیوں کرتا ہوں؟ تو میرا جواب تھا کہ شاید سچ بولنے کا ہمارے ملک میں اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ابرار ندیم کہتے ہیں کہ

تن دا ماس کھوائی رکھنا سوکھا نئیں
درداں نال بنائی رکھنا سوکھا نئیں
اج وی اوہدے ناں تے اڑیاں کردا اے
کملا من پرچائی ر کھنا سوکھا نئیں

اور شعر ملاحظہ فرمایئے گا کہ

دوتن قسماں تے کجھ سفنے
اینے دے وچ آندا کیہ اے

میری یہ خواہش اور دعا ہے کہ دلوں کو موم کرنے والی ابرار ندیم کی شاعری کی یہ رم جھم جاری رہے۔ کتاب کا خوبصورت سرورق ضیاء انجم نے بنایا ہے اور اسے الخیال پبلشرز نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ اعلیٰ طباعت سے مزین 160 صفحات کی اس کتاب کی قیمت تین صد روپے ہے۔ جو کہ اس مہنگائی کے دور میں مناسب ہے۔ عہد حاضر کے نامور شعراء کرام کی آراء کو بھی شاملِ اشاعت کیا گیا ہے جن میں عطاء الحق قاسمی کی رائے بیرونی ٹائٹل پر موجود ہے جبکہ اندرونی صفحات پر منیر نیازی، یونس احقر، عباس تابش، ڈاکٹر ناصر رانا، جمشید مسرور، محمد احسن راجہ، سعد اللہ شاہ ڈاکٹر جواز جعفری کے علاوہ فوزیہ بھٹی کی آراء بھی شامل ہے۔ کتاب میں نظموں اور غزلوں کے علاوہ قطعات اور فردیات بڑے خوبصورت انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ اساں دل نوں مرشد جان لیا پنجابی ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

کرونا وائرس کے عالمی پھیلاؤ کا آنکھوں دیکھا حال

سنتیا گو ائیر پورٹ پر ایک اہلکار نے دوستانہ انداز میں استفسار کیا کہ آپ اس وقت جاپان کیوں جا رہے ہیں؟ وہ تو کرونا وائرس کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ چلی کے عالمی ہوائی اڈے پر یہ پہلا موقع تھا جب میں نے کرونا نام سنا، میں نے اس کی بات کو اس لئے درخور اعتنا نہ سمجھا چونکہ لاطینی امریکہ کے تمام ممالک میں چپٹی ناک اور نیم باز آنکھوں والے تمام افراد کو ہی ''چینو'' یعنی چائینز کہا جاتا ہے۔ بات کہنے کی حد تک ہو پھر بھی زیادہ فرق نہیں پڑتا، ستم ظریفی یہ ہے کہ چھوٹی موٹی ناک اور نیم باز آنکھیں رکھنے والے تمام ممالک کے افراد کو چینی سمجھا بھی جاتا ہے۔ اس لئے جب ائیر پورٹ پر مقامی اہلکار نے دوستانہ وارننگ دی تو میں نے یہی سمجھ کر نظر انداز کر دیا کہ اس بے چارے کو چین اور جاپان کا فرق ہی معلوم نہیں ہے۔ یہ جنوری کا آخری ہفتہ تھا جب میں میکسیکو شہر میں گھوم پھر رہا تھا اور یہاں پر دور دور تک کرونا کا نام ونشان تک نہ تھا، سینما میں فلم دیکھنے کے لئے ہال کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ میکسیکو کی زندگی کا ایک اہم جز اسٹیج ڈرامے بھی ہیں۔ شہر کے عین وسط میں ڈراموں کی بھرمار اور کھوے سے کھوا چھلنے کے محاورے کے مصداق لوگوں کی بھیڑ تھی۔ کھانے، پینے کا رواج وہاں ایسے ہی ہے جیسے اندرونِ شہر لاہور اور گردونواح میں، یعنی اوپن ائیر۔ چھوٹے چھوٹے ریستوران بھی ہیں جن میں چٹ پٹے میکسیکن کھانے لائن میں لگ کر لینے پڑتے ہیں۔

ٹوکیو کے عالمی ہوائی اڈے پر روٹین کی رونق اور بھیڑ تھی۔ حالانکہ کرونا وائرس کا آغاز

دسمبر کے وسط میں ہو چکا تھا مگر ابتدا میں تمام دنیا نے اسے چینی مسئلہ خیال کرتے ہوئے دھیان تک نہ دیا۔امریکہ اور یورپی ممالک نے چین کی مدد کرنے کی بجائے اس وبا سے بچنے کے لئے جن اقدامات کے بارے سوچا وہ یہ تھے کہ نا کہ بندی کردی جائے یا چین سے سامان نہ منگوایا جائے۔ان ابتدائی دنوں میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ اور برطانوی وزیراعظم تو باقاعدہ اس وبائی مرض کا مذاق اڑاتے ہوئے نظر آئے۔صدر ٹرمپ تو اسے چینی وائرس کا نام دیتے تھے۔جاپان میں فروری کا مہینہ کام،کام اور کام کے فرمان قائد کا عملی نمونہ نظر آیا۔وجہ اس کی یہ تھی کہ اولمپک 2020 کا میزبان ملک ہونے کے ناطے اسے تمام کھیلوں کے مقابلوں کے میدانوں اور انتظامات کو حتمی شکل دینے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔مارچ کے ابتدائی دو ہفتے پوری دنیا کو یہ باور کروانے میں بالآخر کامیاب ثابت ہوئے کہ کرونا وائرس فقط چین کا مسئلہ نہیں ہے۔اس کا پھیلاؤ ہمسایہ ممالک تک پہنچ گیا ہے۔ووہان شہر سے پوری دنیا میں پھیلنے والے اس وائرس کے بارے میں پہلی مرتبہ وزارت خارجہ کے ایک چینی ذمہ دار نے امریکہ پر الزام لگایا تھا کہ اس کی افواج جو چین میں پہنچی تھیں،اس وبا کے پھیلاؤ میں ملوث ہیں۔

چین کے بعد سب سے بری طرح اس وبا سے متاثر ہونے والا ملک ایران تھا۔تہران سے تعلق رکھنے والا میرا دوست علی مرتضیٰ گویا بتا رہا تھا کہ اگر دس لوگ ایران میں کرونا وائرس سے ہلاک ہوتے ہیں تو حکومت ایک بتا رہی ہے۔مارچ کے دوسرے ہفتے میں یہ ایرانی دوست کہہ رہا تھا کہ جانتے،بوجھتے بھی ہماری حکومت اسے نہیں روک پائی چونکہ باقی تمام دنیا نے ہم پر ویسے ہی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ہمارا واحد کھلا راستہ چین کے ساتھ ہے جس پر نارمل کاروبار ہو رہا ہے۔اس لئے ہماری مجبوری تھی کہ کورونا وائرس کی تصدیق کے باوجود اس راستے کو کھلا رکھیں۔کل المیہ یہی نہیں،مرنے والوں کے جنازے اور تدفین میں اہل خانہ کو بھی شرکت کی اجازت نہیں دی جارہی،غسل میت تک بند کر دیا گیا ہے۔حکومتی اہلکار ہی کفن اور تدفین کرتے ہیں۔

مارچ کے تیسرے ہفتے میں بھی جاپان میں تمام زندگی روٹین کے مطابق چل رہی تھی۔گرچہ یہ مرض یہاں پہنچ چکا تھا اور پھیل بھی رہا تھا مگر حکومت کا رویہ یہ تھا کہ بس احتیاط کریں۔فکر کی کوئی بات نہیں۔اس طرز عمل کی وجہ شائد اولمپک 2020 کا انعقاد بھی تھا۔اسی سبب سے مجھ سمیت تمام

آبادی اس بارے میں کوئی زیادہ متفکر نہیں تھی اور لوگ اسے بیرونی دنیا کے متعلق کوئی وبا سمجھ رہے تھے۔تیسرے ہفتے تک حکومت کا یہ واضح عزم تھا کہ جولائی کے مہینے میں ٹوکیو اولمپک 2020 منعقد ہوں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں مارچ کے تیسرے ہفتے تک اس بارے میں بالکل بھی فکرمند نہیں تھا۔جاہلانہ حد تک لاعلم تھا۔ذاتی مصروفیات کی وجہ سے اس بارے دھیان ہی نہیں گیا۔دوسری جانب حکومت کی بھی یہی کوشش تھی کہ ہر چیز کو نارمل ظاہر کرے تا کہ اولمپک مقابلے ملتوی نہ ہو جائیں، چونکہ التواء کی صورت میں پانچ سے چھ ارب ڈالر کا نقصان متوقع تھا۔پہلی بار میں نے اس کرونا وائرس کو سنجیدگی کے ساتھ اس وقت لیا۔جب میں اگلے روز پرواز کے لئے ٹوکیو ائیر پورٹ سے ملحقہ ہوٹل میں قیامِ شب کے لیے رُکا۔اس رات جب میں نے انگریزی اخبار کھولا تو بلا مبالغہ کرونا کے علاوہ اس میں کوئی بھی دوسری خبر نہیں تھی۔ٹی وی پر CNN اور BBC دیکھا تو وہاں پر بھی یہی واحد خبر تھی۔اگلی صبح ائیر پورٹ پر بنکاک کی پرواز کے لئے جہاز کے زمینی عملے سے بورڈنگ کروائی تو وہاں انتہائی کم لوگ تھے۔امیگریشن کے کاؤنٹر پر عمومی دنوں کی نسبت آدھے لوگ تھے۔تھائی لینڈ جانے کے لئے جس جہاز میں بیٹھا۔اس میں آدھی سے زیادہ نشستیں خالی پڑی تھیں۔بنکاک ائیر پورٹ پر سراسیمگی کا عالم تھا۔بزنس لاؤنج صرف ایک کھلا تھا، باقی بند کر دیئے گئے تھے۔ائیر پورٹ کی ڈیوٹی فری شاپس کھلی ہوئی تھیں مگر گاہک خال خال ہی نظر آرہے تھے۔، حالانکہ شام چھ، سات بجے کا وقت کام کے اعتبار سے دن کا مصروف ترین وقت ہوتا ہے۔بنکاک سے لاہور کی فلائیٹ بھری ہوئی تھی مگر بہت سارے چہروں پر ماسک نظر آرہے تھے، اکثریت بشمول میرے ماسک اور دستانوں سے بے نیاز تھی۔لاہور ائیر پورٹ پر تھرمل گن سے ہمارے ماتھے کا درجہ حرارت چیک کیا گیا، گھر پہنچ کر بھی گفتگو کا یہ بنیادی موضوع نہیں تھا۔ضمنی موضوع تھا۔شادی ہالوں کی بندش کے سبب خاندان اور دوستوں کے ہاں ہونے والی شادیوں پر واویلا تھا مگر مرض سے خوف کی فضا ہرگز بھی نظر نہیں آرہی تھی۔اسی بے فکری میں آگے چند روز گزر رے۔

کرونا وائرس کا چین نے بڑی ہمت، پامردی اور ذہانت کے ساتھ مقابلہ کیا۔خدا کا کرنا ہوا کہ مارچ کے آخری عشرے میں اس مرض نے یورپ میں شدت اختیار کرنا شروع کر دی۔اٹلی

،سپین سب سے بری طرح اس مرض کے شکنجے میں آ گئے ۔فرانس،انگلستان اور جرمنی سمیت پورا یورپ اس کی لپیٹ میں آ گیا۔روس میں تا دم تحریر اس مرض نے وہ شدت اختیار نہیں کی جس کے سبب بہت سے سازشی نظریات نے بھی جنم لیا ہے۔کرونا کا ڈرامائی انداز میں نیا مرکز امریکہ بن گیا۔کسی بھی ملک سے زیادہ وہاں کرونا سے متاثرہ مریض اور اموات کی تعداد سے دنیا نے اس مرض کو زیادہ سنجیدگی سے لینا شروع کر دیا۔پاکستان سمیت دنیا بھر میں لاک ڈاؤن ہونا شروع ہو گیا۔فارمیسی اور کریانہ کے علاوہ تمام دکانیں،تمام فلائیٹس کینسل۔تمام دنیا فارغ ہو کر گھروں میں بیٹھ گئی ہے۔یہ مرض اس کرہ ارض پر بسنے والے ساڑھے سات ارب انسانوں کے لئے بالکل نیا اور نا قابل یقین لگتا ہے۔میں نے اپنی زندگی میں بنی نوع انسان کو اتنا بے بس نہیں دیکھا۔دس لاکھ سے زیادہ مریض اور پچاس ہزار افراد لقمہ اجل بن چکے ہیں مگر تا دم تحریر کوئی دوا اس مرض کا علاج نہیں کر سکتی۔بس احتیاط ہی ہو سکتی ہے،احتیاط کیجئے اور رحمت کی دعا کیجئے۔

ابنِ عربیؒ اور ارطغرل

ابن عربیؒ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد میں کافی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ اس صوفی درویش نے اپنی مختصر سی زندگی میں آٹھ سو سے زائد کتابیں کیسے لکھ ڈالیں؟ جب اندلس میں ابن عربیؒ نے جنم لیا تو وہاں پر عرب مسلمانوں کی حکومت اپنی طاقت اور استحکام کے عروج پر تھی۔ خدا کے اس ولی نے جو کہ فلسفی، شاعر، محقق اور عالم دین بھی تھا، اپنی زندگی کسی کتب خانے میں نہیں گزاری بلکہ سفر کو وسیلہ ظفر سمجھا۔ حجاز سے لے کر مراکش، حلب اور ایران، عراق سے لے کر ترکی، مصر اور یروشلم تک سفر در سفر تلاش حق، ریاضت اور تبلیغ میں وقت گزارا۔ اس دور میں ذرائع ابلاغ بہت محدود ہوتے تھے اور سفر دشوار گزار تھے، ان کٹھن مسافتوں میں بھی ان کا پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ آج ابنِ عربیؒ سے منسوب ہمارے پاس ساڑھے آٹھ سو کتابیں ہیں جن میں سے سات سو کتب تو مصدقہ ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کتابوں کے نام پر چند صفحات پر مشتمل کتابچے یا پھر رسالے تحریر کیے ہوں۔ تصوف کے موضوع پر ان کی تحریر کردہ ایک کتاب ''الفتوح المکیہ'' کی سینتیس (37) جلدیں ہیں، جن کے مجموعی صفحات کی تعداد پندرہ ہزار ہے۔ ابن عربیؒ جنہیں اہلِ تصوف ''شیخ الاکبر'' کے نام سے پہچانتے ہیں۔ ایک عہد ساز شاعر بھی تھے، ان کے پانچ شعری مجموعے اب تک محفوظ ہیں جنہیں ''دیوان'' کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

دمشق کے ایک مصروف بازار سے ملحقہ تنگ سی گلی مڑتے ہیں تو تھوڑی چڑھائی کے بعد ایک روحانی سلسلے سے منسوب ایک مسجد ہے۔ مسجد کے ایک حجرے میں داخل ہوں تو دس پندرہ

فٹ گہرا کمرہ نظر آتا ہے جسے آپ تہہ خانہ کہہ سکتے ہیں۔اس کمرے کے درمیان میں سبز رنگ کی چادروں میں لپٹی ابنِ عربیؒ کی قبر کا تعویز نظر آتا ہے۔سنگ مرمر کا ایک کتبہ صاحب مزار کا تعارف کروانے کے لئے موجود ہے مگر اس حجرے کی معطر فضا اور انوار کی بارش ہی یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ کسی بزرگ ہستی کی اقامت گاہ ہے۔جیسے جیسے سیڑھیاں اترتے ہیں اور مزار کے قریب پہنچتے ہیں۔رحمتوں کی رم جھم دل پر گرتی محسوس ہوتی ہے۔دروازے پر کھڑے درویش اپنی اپنی باری پر صوفیانہ کلام پیش کرتے ہیں۔ابنِ عربیؒ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صوفی سنیؒ تھے۔مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ سنی اور شیعہ مسلک کے پیروکاروں میں یکساں مقبولیت رکھتے ہیں۔اس امر کا اندازہ ''قاسیون کی پہاڑی'' کہلانے والی جگہ پر واقع ابن عربیؒ کی تربت پر دیس دیس سے آنے والے زائرین کے حلیے سے باآسانی ہوجاتا ہے۔اثناء عشری شیعہ حضرات کے نزدیک بارہ اماموں کے اوپر لکھی گئی ابنِ عربیؒ کی کتاب اس موضوع پر معتبر ترین تحریروں میں شامل ہے۔کتاب کا ذکر آیا ہے تو بتا تا چلوں کہ ''مشکوۃ الانوار'' کے نام سے (101) ایک سو ایک احادیث قدسی کو جمع کر کے شائع کرنا ابن عربیؒ کا ایک منفرد اعزاز ہے۔مشاہدالاسرار کے نام سے چودہ مکالمے خدائے بزرگ و برتر کے حضور اس ولی اللہ نے تحریر کئے ہیں اور ''حلیات الابدال'' روحانیت کے راستے پر چلنے والوں کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو کسی بھی مسافر کے لئے زادِراہ کی ہوتی ہے۔

ابنِ رشد سے ہونے والی ملاقاتوں نے ابنِ عربیؒ کی شخصیت پر بہت گہرے اور دور رس اثرات مرتب کئے ۔ان ملاقاتوں کا احوال تاریخ کا اہم حصہ ہے۔گرچہ یہ ملاقات کروانے میں ابن عربی کے والد کا عمل دخل زیادہ تھا۔جو کہ خود بھی عالم اور حکومتی عہدیدار تھے۔ابن رشد مسلم ہسپانیہ میں قاضی کے منصب پر فائز تھے۔یہاں یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ ابن رشدان چند مسلمان علماء،فلسفیوں اور ماہرین عمرانیات میں سے ہیں۔جن سے عالم مغرب بے حد متاثر ہے۔سابق صدر جارج بش کے نزدیک ابن رشدان کا پسندیدہ مصنف اور ماہرِ عمرانیات ہے،سابق امریکی صدر نے لکھا ہے کہ وہ ابن رشد کی تحریروں سے بے حد متاثر ہے۔ابن عربیؒ کے بقول ابن رشد سے پہلی ملاقات میں ہی اس نے سیکھ لیا ہے کہ روایتی تعلیم اور اشیاء کی حقیقت کے درمیان کیا فرق

ہے۔ابن عربیؒ نے اپنے لئے تصوف کا راستہ چن لیا تا کہ اشیاء کی حقیقت کو پا سکے۔

ترکی کے کچھ ٹی وی ڈرامے گزشتہ چند برسوں کے دوران پاکستانی ناظرین میں بے حد مقبول ہوئے ہیں۔''میرا سلطان''ترک ڈراموں کی وطن عزیز میں مقبولیت کا نقطہ آغاز تھا۔کامیابی کی کئی منزلیں طے کرتے ہوئے آج ہم ایک نئے عہد میں داخل ہو چکے ہیں۔یہ پاکستان میں''ارطغرل غازی''نامی ترک ٹی وی ڈرامے کی مقبولیت کا عہد ہے۔گرچہ میرے خیال میں ترکی سے منگوا کر اردو میں ڈھالے گئے ارطغرل کی کامیابی کی بڑی وجہ کرونا وائرس کے سبب لاک ڈاؤن اور بے پناہ عوامی فراغت بھی ہے۔اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ مذکورہ ڈرامے کا معیار انتہائی اعلیٰ ہے۔ان دنوں جب تمام اہل خانہ کے مل بیٹھنے کا بہانہ بنا ہوا ہے تو فیملی میں بیٹھ کر دیکھے جانے کے قابل ٹی وی ڈرامے اور فلمیں محدود سی ہیں۔امریکی ہالی ووڈ کئی اعتبار سے تمام دنیا کی شو بز انڈسٹری میں بہت آگے ہے۔فلم اور ڈرامہ کے شعبہ میں اس کا معیار بالخصوص بہت اچھا ہے۔خرابی مگر یہ ہے کہ مغرب کے رہنے والوں کا اخلاقی معیار ہم اہل مشرق سے ذرا مختلف ہے۔کب،کہاں کوئی عریاں یا نیم عریاں سین آ جائے،کوئی پتہ نہیں چلتا۔اس لئے اہلِ خانہ کے ہمراہ تو کیا اس کے بعض انٹرٹینمنٹ پروگرام اکیلے بیٹھ کر بھی نہیں دیکھے جا سکتے ہیں۔رہی بات ہندوستانی بالی ووڈ کی،طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ باقی تمام شعبہ جات میں ہالی ووڈ سے چاہے جتنے بھی پیچھے اور پچھڑے ہوئے ہوں مگر فحاشی اور عریانی میں برابر کی چوٹ دیتے ہیں۔بعض اوقات تو بھارتی تفریحی پروگرام ہالی ووڈ کو بہت پیچھے چھوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ایسے کثیف ثقافتی ماحول میں''ارطغرل''ایک تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہو رہا ہے۔

بعض قارئین یہاں جز بز ہوں گے کہ ابن عربیؒ سے یکدم بات شو بز انڈسٹری کی طرف کیسے آن پہنچی؟ کہاں تصوف میں ڈوبے سالک و صوفی اور کہاں فلم،ٹی وی سکرین کی چکا چوند کے مارے لوگ؟ بات کچھ ایسی بے جوڑ اور ان مل بھی نہیں ہے۔مختصر سا قصہ یہ ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے بانی فاتح کی زندگی اور جدوجہد پر مبنی ڈرامہ''ارطغرل''جوان دنوں مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر رہا ہے،اس ڈرامے میں ابن عربیؒ کا بہت اہم کردار دکھایا گیا ہے۔ترک قوم سے اوغوز نسل کے لوگوں کے قائی قبیلے میں جنم لینے والے ہیرو ارطغرل کی زندگی کے ہر اہم موڑ پر ابن عربیؒ کی

رہنمائی اور مدد شامل رہی ہے۔متذکرہ ڈرامہ میں ابن عربیؒ کو سب شیخ کہہ کر پکارتے ہیں۔جس کا سبب ابن عربیؒ کا لقب ''شیخ الاکبر'' ہے۔جن ناقدین کے نزدیک ارطغرل اور ابن عربیؒ کا تعلق فرضی یا افسانوی ہے۔ان کی خدمت میں عرض کردوں کہ دونوں کا تاریخی اعتبار سے ایک ہی عہد ہے۔ابن عربیؒ سن 1165 میں پیدا ہوکر 75 برس کی عمر میں سن 1240 میں خالق حقیقی سے جا ملے اور شام کے شہر دمشق میں مدفون ہیں۔ارطغرل کی تاریخ وفات 1280 ہے اور اس کی قائم کردہ سلطنت تقریباً آٹھ صدیاں قائم رہی۔اس طویل حکمرانی کی نوید ابن عربیؒ نے اپنی زندگی میں ہی ارطغرل کو سنادی تھی۔مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ معیاری تفریح کے ساتھ ساتھ پاکستان کے عوام کو اسلامی تاریخ سے شناسائی ہورہی ہے،علاوہ ازیں اسی بہانے ایک ولی کامل ابن عربیؒ سے نوجوان نسل متعارف ہورہی ہے۔اس خوبصورت ترک ڈرامے کو اردو میں ڈھالنے اور پیش کرنے پر پی ٹی وی مبارکباد کا مستحق ہے۔

کرونا زدہ عید

گزشتہ برس یعنی 2019 کے آخری مہینے میں چین کے شہر ووہان میں ایک عظیم انسانی المیے نے جنم لیا۔ مگر نئے سال کی آمد کا ستقبال اس برس بھی سارے عالم میں روایتی جوش اور جذبے کے ساتھ کیا گیا۔ دنیا کی بیشتر آبادی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کرونا وائرس چین سے نکل کر ان کے شہر اور گاؤں کی گلیوں میں بھی پہنچنے والا ہے۔ اس سال جنوری اور فروری کے مہینے تک تو امریکی صدر ٹرمپ اور برطانوی وزیراعظم بورس جانسن اس کا مذاق اڑاتے نظر آتے تھے۔ مغربی دنیا نے چین کے شہر ووہان سے شروع ہونے والے اس مہلک اور جان لیوا وائرس کے علاج یا اس سے بچاؤ کی طرف بالکل بھی دھیان نہ دیا، جب اس کے پھیلاؤ کی ابھی ابتداء تھی۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے Covid-19 نامی یہ وائرس پورے کرہ ارض تک پھیل گیا۔ پوری انسانیت اس کے شکنجے میں محصور ہو کر رہ گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلی مرتبہ لوگوں کو گھروں تک محدود رہنے پر مجبور کر دیا گیا اور موت بازاروں میں رقص کرنے لگی۔ پاکستان بھی اس آفت سے محفوظ نہیں رہ سکا اور ہر روز ناحق لوگ لقمہ اجل بننے لگے۔ رمضان المبارک کی روایتی مذہبی رونقیں اس کرونا وائرس کے سبب ماند پڑ گئیں اور عید بھی بیماری اور موت کے خوف کی چھاؤں میں آ رہی ہے۔ عید کا مفہوم گلے ملنے اور دوستوں، رشتہ داروں کے ساتھ مل بیٹھنے سے ہی متعلق رہا ہے۔ مگر اس بار شائد یہ ملنا ملانا بھی ممکن نہ ہو سکے۔ دل پر پتھر باندھ کر سب کے لئے یہی پیغام ہے کہ عید پر گھر سے باہر کسی سے ملنے مت جایئے گا۔ کسی سے ہاتھ بھی مت ملائیں اور نہ ہی

گلے ملیں۔عید کی نماز بھی گھر پر ادا کریں۔انشاء اللہ یہ ساری حسرتیں ہم اگلی عید پر پوری کریں گے۔

اس سے ملتی جلتی صورت حال کو جاپانی صنف سخن ''ہائیکو'' میں کسی شاعر نے کچھ یوں بیان کیا تھا

لوگوں سے ملے تم سینہ بہ سینہ
ہم سے ملائے خالی ہاتھ
سچ پوچھو تو عید منائی لوگوں نے

موجودہ صورتحال مزید گھمبیر تر ہے کہ محبوب اب ہاتھ ملانے سے بھی قاصر ہوگا۔لیکن اس احوال کا روشن پہلو یہ ہے کہ اب رقیب اور غیروں سے گلے ملنے کے سبب جو شاعر کو رنج وغم پہنچنے کا اندیشہ تھا اس عید پر وہ احتمال نہیں رہا ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آج سے سو سال بعد آنے والے لوگ ہمارے عہد کو سائنسی اعتبار سے پسماندہ اور دقیانوسی خیالات و زمانہ جاہلیت سے تعبیر کریں۔اگلی صدی کے لوگ اس میں حق بجانب بھی ہوں گے کہ کیسے سات ارب آبادی کی دنیا ایک معمولی وائرس کے سامنے بے بس ہوگئی،لاکھوں لوگ موت کے منہ میں چلے گئے،جو بچ گئے ہیں وہ بھی قسمت کی خوبی سے بچے ورنہ میڈیکل سائنس کا اس میں کوئی کردار نہیں ہے۔ایک بات مگر آج سے صدیوں بعد آنے والے شاید نہ جانتے ہوں گے کہ ہم اپنے عہد کو تاریخ انسانی کا جدید ترین عہد سمجھتے تھے۔ہم سوچا کرتے تھے کہ سو سال پہلے اور اس سے پیشتر انسان کتنا پسماندہ تھا کہ معمولی بیماریوں کی وجہ سے لاکھوں،کروڑوں لوگ لقمہ اجل بن جایا کرتے تھے۔اس کرہ ارض پر بسنے والے کسی انسان نے چھ ماہ قبل یہ سوچا بھی نہ تھا کہ تمام دنیا فارغ ہوکر گھروں میں بیٹھ جائے گی۔ہر چیز بند ہو جائے گی۔مکمل لاک ڈاؤن ہوگا۔بڑی معذرت کے ساتھ کہ لاک ڈاؤن بھی بے سود ثابت ہوگا۔لگتا ہے آنے والے لوگ بھی ہم پر ایسے ہی ہنسیں گے،جیسے گزرے زمانے کے انسانوں کی لاچارگی پر ہم ہنستے تھے۔سچ پوچھیں تو اس کرونا نامی وائرس نے ہمیں یہ احساس تو دلا دیا ہے کہ ہم آج بھی مجبوری کی اسی حالت میں کھڑے ہیں جہاں انسان کم وبیش ایک صدی پہلے کھڑا تھا۔میری مراد 1920 کے ہسپانوی فلو سے ہے۔جس میں پانچ کروڑ لوگ لقمہ

اجل بنے۔جن میں سے پونے دو کروڑ کے قریب ہندوستانی تھے۔سپین کا ذکر آیا ہے تو برسبیل تذکرہ کرونا ہسپانوی زبان ہی کا لفظ ہے جس کے معنی تاج کے ہیں اور اس ''تاجدار وائرس'' نے ہمارا ترقی وعلمیت کا سارا غرور خاک میں ملا دیا ہے۔ابھی پتا نہیں کیا کیا ہونا باقی ہے۔

ملن کا موسم

سردیوں کا موسم پاکستان میں شادیوں کا موسم بھی ہوتا ہے ۔اگرچہ کرونا وبا COVID-19 کے عالمی پھیلاؤ کی وجہ سے اس مرتبہ روایتی عروسی گہما گہمی تو نظر نہیں آتی مگر پھر بھی کچھ اہم شادیوں کی بازگشت ہمارے میڈیا کا محبوب موضوع بنی ہوئی ہے۔افریقہ کے جنگلات میں آباد مسائی قبیلے میں یہ روایت رہی ہے کہ جب تک لڑکا شیر کا شکار نہیں کرتا اس کی شادی طے نہیں کی جاتی۔پنجاب کے پانچ دریاؤں کے اردگرد بسنے والے لوگوں کے اپنے مخصوص خصائل اور روایتیں رہی ہیں۔ہمارے دریائے راوی کے اردگرد بسنے والے کچھ قبائل میں یہ روایت تھی کہ جب تک نوجوان چوری نہ کرے اس کی شادی نہیں کی جاتی تھی۔کہا یہی جاتا تھا کہ لڑکا ابھی اپنے پاؤں پر تو کھڑا ہو جائے، کامیاب واردات کے بعد سب کہتے کہ اب لڑکا اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے۔شائد اسی لئے مثل مشہور ہوئی کہ سندھ صادقاں، راوی راشقاں، چناب عاشقاں اور جہلم کے بارے میں جملہ معترضہ ہے۔

مال مسروقہ میں بھینس کی چوری دریائے راوی کے اردگرد آباد لوگوں میں سب سے زیادہ عام تھی۔واقعہ یوں ہوا کہ ہمارے شہر، جو کہ راوی سے زیادہ دور نہیں، کے رہائشی کسی شریف آدمی کی بھینس چوری ہوگئی سراغ لگانے والے کھوجی نقشِ پا ڈھونڈتے ہوئے بالکل درست جگہ پر ''کھرا'' لے گئے۔نئی نسل کے نوجوان قاری شائد کھوجی کے معنی اور مفہوم سے نابلد ہوں۔سہولت کے لئے عرض کردوں کہ پرانے دور کے پرائیویٹ Detective جو پاؤں کے نشانات زمین پر

دیکھ کر مجرم کا کھوج لگاتے تھے۔کھوجی کہلاتے تھے۔قصہ کوتاہ، کچھ معززین اور بارسوخ افراد کو معاملے کے درمیان ڈالا گیا،تاکہ مال مسروقہ واپس دلوائیں۔مشکوک قبیلے نے تسلیم کرلیا کہ چوری شدہ بھینس ان ہی کے پاس ہے مگر واپس دینے سے انکار کردیا۔عذر یہ پیش کیا کہ وہ بھینس اس لئے واپس نہیں کرسکتے۔کیونکہ یہ ان کے ہونہار لڑکے کی پہلی چوری ہے۔اگر بھینس واپس کی گئی تو ''بے برکتی'' ہوگی،اس لئے معززین جو بھی قیمت طے کریں وہ اس بھینس کی ادا کرنے کے لئے تیار ہیں،مگر بھینس واپس کرنے سے باوجوہ قاصر ہیں۔راوی کے اردگرد آباد انہی قبائل میں سے ایک قبیلہ مور بھی ہے،جن کے متعلق ضرب المثل مشہور ہوئی کہ ''چوروں کو پڑ گئے مور''یعنی ان کے ہاتھوں تو چور بھی لٹ جاتے تھے۔

کینیا کے ایک مسائی نوجوان سے جو کہ جنگل میں ٹورسٹ گائیڈ کے طور پر کام رہا تھا،میرے بڑے بھائی نے پوچھا کہ اس نے بھی کوئی شیر شکار کیا ہے؟ تاکہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوسکے۔یا کہ یہ مرحلہ ابھی باقی ہے؟ جواباً مسائی نوجوان نے بتایا کہ اب حالات بدل گئے ہیں اور شیر کا شکار کئے بغیر بھی شادی ہوجاتی ہے۔مسائی جنگجو اور بہادر ہوتے ہیں،اس کا اندازہ تو آپ کو ازدواجی شرائط سے ہی ہوگیا ہوگا،مزید برآں کینیا اور تنزانیا میں یہ قبائل وہاں وہاں آباد ہیں،جہاں شیر کا شکار کھیلا جاتا ہے اور انہیں ''گیم پارک'' بھی کہتے ہیں۔زمانہ قدیم سے انگریز شکاری جب شیر کا شکار کھیلنے آتے تو ان مسائی لوگوں سے مدد لیتے تھے۔اسی لئے یورپی شکاریات پڑھ کر یہ مسائی اساطیری کردار محسوس ہوتے ہیں۔مگر افریقہ کے تمام قبائل میں سے اس قبیلے کے لوگوں کی ایک بات واقعتاً منفرد رہی ہے،نوآبادیاتی جارحین یہ بات بخوبی جانتے تھے،کہ مسائی قبیلے کے کسی فرد کو غلام نہیں بنایا جاسکتا۔حالانکہ افریقہ صدیوں تک غلاموں کی خرید وفروخت کی سب بڑی منڈی بنا رہا ہے۔یہاں سے دنیا بھر میں غلام برآمد کئے جاتے رہے ہیں۔اس بابت مسائیوں کے استثنیٰ کی وجہ یہ تھی کہ جیسے ہی کسی مسائی کو قید کیا جاتا وہ کھانا پینا ترک کردیتا،بے حس وحرکت پڑا رہتا،یہاں تک کہ لقمہء اجل بن جاتا۔اسی سبب سے بیرونی حملہ آوروں نے مسائی قبیلے کے افراد کو غلام بنانے کی کوششیں بھی ترک کردیں کہ یہ وقت،توانائی اور سرمائے کا ضیاع تھا۔

ایک افریقی دانشور سے اس متعلق گفتگو ہوئی تو اس نے بڑی دلچسپ اور عجیب وغریب

وضاحت پیش کی تھی ۔اس کا کہنا تھا کہ مسائی قبیلے کے لوگ لمحہ ،موجود میں زندہ رہتے ہیں،ان کے نزدیک زندگی کا مفہوم فقط یہی گھڑیاں ہیں جو ہم گزار رہے ہیں،وہ انہیں ہی جیون جان کر جیتے ہیں ۔جب ان کو قید میں ڈالا جاتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ قید بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے، مستقل اور دائمی اسیری ہے۔اس لئے وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔مگر یہ ماضی کی باتیں ہیں،اب یہ لوگ زیادہ تر نمائشی کرداروں میں نظر آتے ہیں ۔گائیڈ اور اداکار کا کردار مسائی لباس وحلیہ اور روپ دھار کر سیاحوں کو لبھانے کے لئے ادا کرتے ہیں ۔ورنہ شیر کے شکار کی شرط اگر اب بھی مسائی نوجوانوں کی شادی کے لئے عائد ہوتی تو ان میں سے غالب اکثریت کنوارے ہی مر جاتی ۔کم از کم مذکورہ گائیڈ کی صحت دیکھ کر تو با آسانی پیش گوئی کی جا سکتی تھی کہ وہ شیر کا شکار اور شادی کے بندھن میں بندھے بغیر ہی اس عالم رنگ و بو کو خیر باد کہے گا۔

شہرِ سخن

اقوام متحدہ کا ادارہ برائے تعلیم و ثقافت یونیسکو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ امن اور تحفظ عامہ کے مقصد کے تحت قائم ہونے والے اس ادارے کا منشور ہے کہ ثقافتی ملاپ اور تعلیم و سائینس کے شعبے میں عالمی سطح پر تعاون سے بین الاقوامی امن و امان کا حصول ممکن ہے۔ اقوام متحدہ کے اس ذیلی ادارہ کی جانب سے لاہور کو ادب کا شہر قرار دیا گیا ہے۔ لاہور پاکستان کا پہلا شہر ہے جسے اس قسم کا اعزاز یونیسکو سے ملا ہے۔ شہرِ لاہور صدیوں سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس پس منظر میں اسے عالمی ادارے کی جانب سے ادب کا شہر قرار دیا جانا، ایک مستحسن اقدام ہے۔ اور اس شہر کے ایک تاریخی وصف کا اعتراف بھی ہے۔

مغل بادشاہ جہانگیر کی چہیتی ملکہ نور جہاں نے اپنے ایک فارسی شعر میں لاہور کو اپنی جان کے برابر قیمت ادا کر کے خرید کر بھی سستا خرید لینے کا اعلان کیا ہے۔ وہی ملکہ نور جہاں جو برصغیر پاک و ہند کی واحد خاتون ہے جن کے نام کے سکے جاری ہوئے۔ شہنشاہ جہانگیر نے جو اپنی زندگی کی محدود ڈھائی ضرورتیں بتائیں ان میں سے ایک یہی شاعرہ ملکہ بیان کی گئی ہیں۔ اپنی زندگی کی آخری دو دہائیاں لاہور میں گزار کر اسی شہر میں اپنے شوہر شہنشاہ کے قریب مدفون ہیں۔ یہ مقبرہ بھی ملکہ نے خود تعمیر کروایا تھا۔ اس وضاحت کی طوالت کی وجہ یہ بھی ہے کہ بار بار ذہن نور جہاں کا نام سن کر ملکہ ترنم نور جہاں کی طرف جاتا ہے۔ میڈم نور جہاں نے گرچہ لاکھوں دلوں پر حکومت کی ہے اور لاہور کی آن بان شان ہیں، مگر یہاں ملکہ نور جہاں سے مراد مغل شہنشاہ کی زوجہ

محترمہ ہیں۔جن کا یہ شعران کے شاہدرہ میں واقع مزار کی لوح پر درج ہے۔

برمزارِ ما غریباں نی چراغی نی گلی
نی پرِ پروانہ سوزد نی صدائی بلبلی

مغلیہ عہد سمیت ایک ہزار سال تک لاہوری ادب زیادہ تر فارسی زبان میں تخلیق کیا گیاہے۔بعض دوستوں کے لئے شاید یہ حیرت کا سبب ہو کہ راجہ رنجیت سنگھ اور تمام سکھ عہد میں تختِ لاہور کی سرکاری زبان فارسی تھی۔فارسی زبان اور شہر کے اسی ایک ہزار سال پر محیط باہمی تعلق پر گورنمنٹ کالج کی فارغ التحصیل ہماری ہم مکتب ساتھی سکالر ڈاکٹر انجم طاہرہ نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے ،فارسی زبان میں شائع ہونے والی ''لاہور درشعرِ فارسی'' ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔فارسی اب لاہور میں چونکہ زیادہ مقبول نہیں رہی،اس لئے اس زبان میں تخلیق کیا گیا ادب بھی اب ویسا مقبول نہیں رہا جیسا کبھی ہوا کرتا تھا۔

مقامی زبانوں کی بات کریں تو شاہ حسین سے چراغوں کا ایک سلسلہ علامہ اقبال اور فیض احمد فیض تک آتا ہے۔اگر چہ بلھے شاہ قصور اور وارث شاہ شیخو پورہ میں مدفون ہیں مگر دونوں کا پیر خانہ لاہور میں ہی تھا اوران کے مرشد عنائیت قادری اسی شہر میں دفن ہیں جن سے کسبِ فیض کیا۔سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی سے لے کر انتظار حسین ،اشفاق احمد،منوّ بھائی،منیر نیازی ایک طرف شعروسخن سے اس شہر کی فضا مہکاتے رہے تو دوسری جانب استاد دامن اور حبیب جالب جیسے عوام دوست انقلابی قرطاس وقلم کو وقار بخشتے رہے۔ساغر صدیقی اور ناصر کاظمی نے اک نئے رنگ اور آہنگ کو روشناس کرایا تو پطرس بخاری اور ن م راشد نے بھی دبستانِ لاہور کو اپنے فن سے رونق بخشی۔اہلِ قلم کی ایک الگ نوعیت کی کہکشاں لاہور فلم انڈسٹری کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی ادبی افق پر نمودار ہوئی۔احمد راہی،تنویر نقوی،مسرور کاظمی،احمد عقیل روبی کا نام فقط حوالے کے طور پر تحریر کر رہا ہوں۔ایک طرف شو بز سے وابستہ اہلِ سخن تو دوسری طرف راہِ سلوک کے مسافر ادیب اور شاعر اس نگر سے گزرے ہیں۔اپنی تحریر سے خوشبو پیدا کرنے والے اور اپنے حرفوں کی روشنی سے بھٹکے ہوؤں کو صراطِ مستقیم دکھانے والے واصف علی واصف ایک انوکھے اور لازوال رنگ ڈھنگ کے طرزِ تحریر کی بنیاد رکھ گئے۔

لاہور کے ادبی منظر نامے کا ایک تاریخی حصہ ادبی محافل رہی ہیں۔اس شہر کے اہل حرف کی بیٹھک گزشتہ ایک صدی سے عموماً چائے خانوں اور کافی ہاؤسز پر ہوا کرتی تھی۔شاعری اور نثر کے تازہ تخلیقی نمونے یہاں برپا ہونے والی تنقیدی نشستوں میں پیش کئے جاتے تھے۔اور صاحبِ کلام اکثر پیش کرنے کے بعد پچھتاتے تھے، چونکہ بقول شخصے اس شہر کے نقاد بہت ظالم اور سنگ دل واقع ہوئے ہیں۔اس عہد رفتہ کی واحد یادگار پاک ٹی ہاؤس ہے۔یہ چائے خانہ لاہور کی ایک صدی کی ادبی تاریخ کا عینی شاہد ہے۔یہ بھی ٹھکانہ باقی نہ رہتا اگر نواز شریف حکومت اس سلسلے میں خصوصی کاوش نہ کرتی اور معاصر لکھاری مسلسل اس کی بحالی کا مطالبہ شدومد سے جاری نہ رکھتے۔میں چونکہ گورنمنٹ کالج کے نیو ہاسٹل میں مقیم تھا، اس لئے زمانہ طالب علمی میں پاک ٹی ہاؤس اکثر پیدل چلا جاتا تھا۔منوّ بھائی بھی کسی زمانے میں وہاں مستقل جاتے تھے۔ایک بار ان کے گھر ملنے گیا تو پوچھنے لگے کہ آج کل بھی ٹی ہاؤس جاتے ہو؟ میں نے نفی میں جواب دیا کہ کبھی کبھار۔کہنے لگے کہ اچھا کرتے ہو، اسی لئے تمہاری صحت بہتر لگ رہی ہے۔شہرت بخاری، خالد احمد، محسن نقوی، اسلم کولسری، شہزاد احمد، مشکور حسین یاد، بانو آپا کتنے سارے ستاروں جیسے نام ہیں جو پاک ٹی ہاؤس کے نام کے ساتھ ہی ذہن میں چمک اٹھتے ہیں۔یہ انہی رفتگان کا فیض ہے کہ اقوام متحدہ جیسے معتبر ادارے نے داتا کی نگری کو ''شہرِ سخن'' قرار دے دیا ہے۔رنگوں، خوشبوؤں اور روشنی کا یہ ادبی سلسلہ آج بھی بڑے پروقار اور معیاری انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔لاہور کی یہ خوش قسمتی ہے کہ پاکستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے سینکڑوں اہلِ قلم اس ادبی فضاء کو معطر کرنے میں مصروف عمل ہیں۔خدا اس شہرِ سخن اور اس کے سخنوروں کے ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔

تعلیم کی اہمیت اور پاکستان

اس کرۂ ارض پر زندگی کے ابتدائی دور کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں انسانوں اور جانوروں کے انداز زیست میں کوئی زیادہ فرق محسوس نہیں ہوگا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں انسانوں میں ہمہ جہت ارتقاء نظر آتا ہے، جبکہ دیگر مخلوقات ایک ہی ڈگر پر کم وبیش یکساں زندگی گزارتی نظر آتی ہیں۔انسان جنگلوں سے نکلا، اس نے بستیاں بسائیں شہر آباد کیئے۔لاکھوں سال کے ارتقائی عمل کے نتیجے میں بنی نوع انسان نے آج کی دنیا کا سماجی، معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ تشکیل دیا، جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔آج ہمارے آسمان تلے انسانوں اور جانوروں کی زندگی کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو ہمیں کسی طرح کا کوئی مقابلہ ہی نظر نہیں آتا۔انسان اشرف المخلوقات تو اپنی تخلیق کے وقت بھی تھا مگر عہدِ حاضر میں واضح طور پر اس نے دیگر زمینی مخلوقات پر عملی طور پر سبقت ثابت بھی کر دی ہے۔اس انسانی ترقی کی سب سے اہم وجہ تعلیم ہے۔انسان اور جانور میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جانوروں میں ہر نفس اپنی زندگی سے خود سیکھتا ہے اور اپنی زندگی کے خاتمے کے ساتھ ہی وہ اپنے تمام تجربات اور علم بھی اپنے ساتھ اس جہانِ فانی سے لے جاتا ہے۔جبکہ انسان اپنا علم اور تجربات ہزاروں، لاکھوں سال سے اپنی اگلی نسلوں کو منتقل کرتے آئے ہیں۔آج جو انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے وہ پوری انسانی تاریخ کا علم لیکر پیدا ہوتا ہے، بالفاظ دیگر بنی نوع انسان نے آج کی تاریخ تک جو علم حاصل کیا ہے وہ آج جنم لینے والے بچے کی دسترس میں ہے۔

قیام پاکستان کے وقت اس سرزمین پر تعلیمی حالت دگرگوں تھی۔اس ناگفتہ بہ حالت کی ذمہ داری بہت حد تک اور جائز طور پر تاج برطانیہ پر عائد ہوتی ہے جو کہ کم از کم سو سال کا عرصہ ہندوستان اور موجودہ پاکستان پر ناجائز طور پر قابض رہا۔جب برطانوی راج سے ہمیں آزادی ملی تو برصغیر پاک و ہند میں شرح خواندگی (12%) بارہ فیصد تھی۔اس مجرمانہ غفلت پر نوآبادیاتی نظام قائم کرنے والے برطانیہ کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔پاکستان بننے کے بعد ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ لوگوں نے اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے پر خصوصی توجہ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم 12% فیصد شرح خواندگی سے آج ہم ساٹھ فیصد شرح خواندگی تک پہنچ گئے ہیں۔ذاتی طور پر مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ پاکستان میں آج چاہے کوئی امیر ہو یا غریب،شہری ہو یا دیہاتی،اپنے بچوں کو سبھی زیور تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں۔اس تعلیمی ذوق وشوق کو دیکھ کر یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب پاکستان کی شرح خواندگی سو فیصد ہوگی۔

کچھ ذمہ داری اس بابت موجودہ حکومت پر بھی عائد ہوتی ہے۔مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تعلیم کا شعبہ شاید ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات میں شامل ہی نہیں ہے۔ورنہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اس دورِ گرانی میں جب ہر چیز کی قیمت بڑھ رہی ہے آپ ہائر ایجوکیشن کمیشن کا بجٹ کم کر دیں۔تعلیمی وظائف کی منسوخی اور ذہین طلباء کے مخصوص داخلہ کوٹے کا خاتمہ کسی طور پر بھی پاکستان میں شرح خواندگی میں اضافے کا سبب نہیں بن سکتا۔

یہ بات درست ہے کہ کرونا وبا کے عالمی پھیلاؤ سے دنیا بھر کی معیشتیں متاثر ہوئی ہیں،مگر مہذب ممالک نے ان معاشی مشکلات کا حل زیادہ تخلیقی انداز میں نکالنے کی کوشش کی ہے۔جاپان کی سب سے بڑی یونیورسٹی ٹوکیو یونیورسٹی ہے۔جاپانی حکومت نے جب کرونا وباء کے باعث معیشت میں گراوٹ کا رجحان دیکھتے ہوئے ٹوکیو یونیورسٹی اور دیگر درس گاہوں کی کچھ مراعات ختم کرنے اور رعائتیں واپس لینے کا فیصلہ کیا تو اس کے ساتھ ہی اقتصادی قوانین میں کچھ نرمی پیدا کردی۔اب یونیورسٹیاں اپنے ''بانڈز'' مارکیٹ میں فروخت کرسکتی ہیں۔اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹوکیو یونیورسٹی نے تیس ارب روپے مالیت کے یونیورسٹی بانڈز جاری کیئے ہیں۔اس کا مقصد جامعہ کے تحقیقی اور تعلیمی منصوبوں کو آگے بڑھانا ہے۔دل تھام کے سنئے کہ یونیورسٹی اگلے

دس برس میں ڈیڑھ سوارب روپے کے یونیورسٹی بانڈز جاری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جن پر وہ تقریباً ایک فیصد کے قریب اپنے صارفین کو سود بھی ادا کرے گی۔ حاصل شدہ رقم سے تعلیمی سہولیات کو بہتر بنایا جائے گا۔ ذہین طلباء کو زیادہ تعداد میں وظائف دیئے جائیں گے۔ جدید دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آن لائین تعلیمی پروگرام جاری کئے جائیں گے۔

اس تذکرے کا مقصد ٹو کیو اور اوساکا یونیورسٹی کا پنجاب یونیورسٹی یا جامعہ کراچی سے تقابل نہیں ہے، بلکہ امکانات کا جائزہ لینا ہے۔ جو قومیں تعلیم کو اہم سمجھتی ہیں، اگر ان کو تدریس کے شعبے میں مختص بجٹ سے کٹوتی کی ضرورت پیش آئے تو وہ کوئی متبادل بھی تلاش کرتی ہیں۔ ہماری موجودہ حکومت کی طرح طلباء کے وظائف منسوخ کر کے انہیں در بدر بھٹکتا نہیں چھوڑ دیتی ہیں۔ سمجھدار والدین اپنے بچوں کو اپنا پیٹ کاٹ کر بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے ہیں۔ خود روکھی سوکھی کھا کر بھی اپنی اولاد کو علم کی دولت سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتے نہ رہ جائیں۔ ریاست کا اپنے شہریوں کے ساتھ بھی وہی رشتہ ہوتا ہے جو والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

یہاں مجھے لاطینی امریکہ کی پہلی نوبل انعام یافتہ ماہرِ تعلیم، سفارتکار اور شاعرہ گبریلا مسترال یاد آرہی ہیں۔ بلاشبہ ہسپانوی شاعری کو مسترال نے ایک نیا نسوانی لہجہ عطا کیا مگر ان کا اصل عالمی تعارف ماہرِ تعلیم کے طور پر ہی ہے۔ اسی حیثیت سے انہوں نے متعدد بار لیگ آف نیشنز اور اقوام متحدہ کو خطاب بھی کیا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے ان کی شاعری کو ہسپانوی زبان سے براہ راست اردو میں ترجمہ کرنے کا شرف حاصل کیا ہے جسے لاہور سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ایک پرائمری سکول میں پڑھانے سے زندگی کا آغاز اور تادمِ مرگ دنیا بھر میں تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول رہنے والی اس نیک دل خاتون نے کیا خوبصورت بات کہی، کہ انسانی تاریخ نے ہمیں سکھایا ہے کہ آزادی اور تہذیب کا

حصول صرف اور صرف تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ دوسرا راستہ ہمیں حیوانیت اور جنگل کی طرف واپس لے جاتا ہے۔

میاں چنوں کا عالمی مشاعرہ

مشاعرہ برصغیر کی شعری روایت کا ایک خوبصورت پہلو ہے۔شاعری تو ہزاروں سال سے دنیا بھر کے ہر کونے میں ہوتی آ رہی ہے مگر ہماری شاعری کا اہم امتیاز جو اسے ''پرفارمنگ آرٹ'' بناتا ہے، وہ مشاعرہ ہے اگر فنونِ لطیفہ میں شاعری کو وہی حیثیت حاصل ہے جو جسم میں دل کو حاصل ہوتی ہے،تو پھر مشاعرے کی مثال روح جیسی ہے جو شاعری کی ترویج اور زندگی کے لیے ضروری ہے۔ بڑے بڑے شہروں کے بڑے بڑے مشاعروں کا احوال تو آپ پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں۔مگر پاکستان میں ایک چھوٹا سا شہر ایسا ہے جہاں مشاعرے بہت بڑے بڑے ہوتے آئے ہیں۔میری مراد میاں چنوں سے ہے۔اہلِ ذوق میاں چنوں کو پنجاب کا لکھنوء بھی کہتے ہیں۔جنوبی پنجاب کی ملتان ڈویژن میں واقع اس تحصیل میں شعر اور مشاعرے کی روایت بہت توانا ہے۔ مشاعرے کی اسی درخشندہ روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے بلدیہ میاں چنوں نے ادبی وسماجی تنظیم راوی فاؤنڈیشن کے تعاون سے ایک عظیم الشان عالمی عیدملن مشاعرے کا اہتمام کیا۔کیلنڈر پر نظر دوڑائیں تو گزشتہ چند برس میں ایسا اعلیٰ پائے کا مشاعرہ شاید پاکستان میں اور کہیں بھی نہیں ہوا۔ یہ مبالغہ آرائی نہیں مہمان شعراء کرام کے نام دیکھیں تو آپ کو خود ہی یقین آ جائے گا۔مشاعرے کی

صدارت ہمارے عہد کے عظیم شاعر ظفر اقبال نے کی جبکہ مہمانان خصوصی انور مسعود، عطاء الحق قا سمی اور امجد اسلام امجد تھے۔ جبکہ نظامت کے فرائض وصی شاہ اور ڈاکٹر صغرا صدف نے ادا کیے۔

منو بھائی نے اس مشاعرے میں شرکت کرنے اور اس کی صدارت کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر شدید علالت کے باعث وہ اس محفل میں شریک نہ ہو سکے۔ اللہ تعالی انہیں صحتِ کامل عطا فرمائے ۔ ماضی میں جب بھی ان کو میاں چنوں کے مشاعرے میں بلایا گیا تو وہ ضرور تشریف لاتے تھے۔ عید کے دن جب وہ ہسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں زیر علاج تھے تو ہمارے شاعر دوست شو کت فہمی نے ان سے پوچھا کہ میاں چنوں کے مشاعرے میں جانا ہے؟ تو کہنے لگے ضرور چلیں گے۔ ان کے علاوہ مدعو کے گئے تمام شعراء کرام نے مشاعرے میں شرکت کی۔

مشاعرے کے منتظمین کا خیال تھا، جن میں چیئرمین بلدیہ چوہدری ندیم اختر ایڈووکیٹ اور رانا بابر حسین ایم پی اے کے علاوہ راقم الحروف بھی شامل تھا، کہ مقامی شعراء کرام کو بھی مشاعرہ پڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ مگر میاں چنوں کی سرزمین شعر و ادب کے حوالے سے اس قدر زرخیز ہے کہ مقامی شعراء کرام کی تعداد پچیس تک پہنچ گئی۔ لہذا تمام شعراء کرام نے مشترکہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ مہمان شعراء کے اعزاز، اکرام میں اس شہر کا کوئی بھی شاعر مشاعرہ نہیں پڑھے گا، مگر اچھی بات یہ ہوئی کہ چھ گھنٹے طویل اس پروگرام میں تمام مقامی شعراء آخر تک اپنی نشستوں پر تشریف فرما رہے۔ یہاں قارئین کے لیے یہ انکشاف شاید حیران کن ہو کہ سامعین کی تعداد ہزاروں میں تھی اور وہ آخر تک رہی نشستوں پر بیٹھے رہے۔ بلکہ مشاعرہ کے اختتام تک ایسے لوگوں کی بڑی تعداد موجود تھی جن کو بیٹھنے کے لیے نشست ہی دستیاب نہ ہو سکی اور انہوں نے یہ مشاعرہ کھڑے ہو کر ہی سنا۔ یہ تعداد ان لوگوں کے علاوہ تھی جو گھروں میں بیٹھ کر کیبل ٹی وی پر مشاعرہ

براہ راست دیکھ رہے تھے۔ دنیا بھر میں فیس بک پر لائیو پروگرام دیکھنے والوں کی تعداد بھی یقیناً قابلِ ذکر ہے۔

مشاعرے سے قبل راقم الحروف کی رہائش گاہ پر عشائیے کا اہتمام تھا جس کے بعد تمام شعراء کرام جلوس کی شکل میں مشاعرہ گاہ روانہ ہوئے۔ ڈھول، تاشوں اور میوزک بینڈ کے علاوہ آتش بازی کا مظاہرہ کیا گیا۔ تمام شہر اور بالخصوص بلدیہ کی عمارت کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ جیسے ہی شعراء کرام سبزہ زار میں داخل ہوئے ان کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور گل پاشی کی گئی۔

مشاعرے کا آغاز حمد سے کیا گیا جس کے بعد پاکستان کے معروف نعت خواں اور شاعر علی رضا نے ہدیۂ نعت پیش کیا تھا پھر خطبہ استقبالیہ کے لیے چیئرمین بلدیہ میاں چنوں چوہدری ندیم اختر ایڈووکیٹ کو مدعو کیا گیا۔ انہوں نے شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور شہر کے لیے اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کا خاکہ پیش کیا۔ اس کے بعد مشاعرے کا باقاعدہ آغاز کیا گیا اور مظہر بخاری نے نظامت کے فرائض ڈاکٹر صغرا صدف کے سپرد کیے۔ خوبصورت لب و لہجے کے شاعر ابرار ندیم نے سب سے پہلے اپنا پنجابی کلام پیش کیا۔ اس کے بعد مقبول رومانوی شاعر حسن عباسی نے جب اپنے اشعار سامعین کی نذر کیے تو اس شعر پر انہیں بہت داد ملی کہ

اُس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

ان کے بعد نبیل نجم نے بھی خوب داد سمیٹی۔

معروف مزاحیہ شاعر خالد مسعود خاں کی طبیعت کچھ ناساز تھی مگر وہ بیماری کے باوجود خصوصی طور پر ملتان سے تشریف لائے مگر جلدی پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا جس کا احترام کیا گیا۔ ان

کے بعد قمر رضا شہر اور رضی الدین رضی نے پڑھا اور بھرپور داد پائی۔ فاخرہ انجم کی شاعری کو سامعین نے بہت پسند کیا اور ان کو شہر کے مشاعرے کے لیے شادی بیاہ جیسی رونق بہت پسند آئی۔ بسمل صابری نے جب یہ شعر پڑھا۔

وہ اشک بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

تازہ کار شاعر ندیم بھابھہ کے گھر میں کچھ اہم نجی مصروفیت تھی مگر پھر بھی وہ ملاقات کرنے کے لیے خصوصی طور پر میلسی سے تشریف لائے۔

قطر سے تشریف لائے شاعر فرتاش سید جب غزل سنا کر جانے لگے تو لوگوں نے شور اٹھا دیا کہ اور پڑھا جائے اور اگلی غزل پر بھی انہیں پہلی سے بڑھ کر داد ملی۔ منفرد لب و لہجے کی شاعرہ لبنیٰ صفدر نے بھرپور داد سمیٹی۔ گزشتہ دنوں ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہونے والی مقبول شاعرہ صحتیابی کے بعد مشاعرہ میں تشریف لائیں تو طاہرہ سرا کا لوگوں نے بھرپور استقبال کیا۔ فیصل آباد سے آئے ہوئے علی زریون نے اپنے مخصوص انداز میں جب شاعری سنائی تو لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔ مسقط عمان میں تدریس کے شعبے سے وابستہ شاعر فہیم ضیاء بھی خصوصی طور پر محفل میں شریک ہوئے۔ ناروے سے جواد شیخ اور آفتاب وڑائچ اس عالمی مشاعرے کی زینت بنے اور فرانس سے تشریف لائے ہوئے شاعر ایاز محمود ایازؔ بھی شریکِ محفل تھے۔ جنہوں نے اس بزم کو اور بھی خوبصورت بنا دیا۔ ہندوستان سے علینا عترت اور اظہر عنائیتی کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان کے لیے خصوصی دعوت نامے بھیجے گئے مگر انہیں پاکستان کا ویزہ نہیں مل سکا۔ حالانکہ کئی سینئر پاکستانی شعراء نے ان کے ویزے کے لیے ہماری مدد اور کوشش کی ۔ بصارت سے محروم خوبصورت شاعر تیمور حسن

تیمور نے ''تیرا کیا بنا'' ردیف کی غزل سنائی تو محفل میں جیسے جان آ گئی۔ تیمور کالج فرسٹ ائیر سے میرے دوست ہیں اور آجکل سائنس کالج لاہور میں پروفیسر ہیں۔ سہیل عابدی اور زاہد شمس کے بعد سعدیہ صفدر سعدی نے بھی اپنا کلام سنایا اور بہت داد پائی۔

طاہر نسیم کے اس شعر کو بہت پسند کیا گیا۔

تمام شہر ہی قاتل کا ہم نوا نکلا
ہمارے حق میں کسی کا بیان تھا ہی نہیں

گلِ نوخیز اختر اور ڈاکٹر صغرا صدف کی نوک جھونک سے سامعین بہت لطف اندوز ہوئے اور محفل میں دیر تک قہقہے بکھرتے رہے۔ صوفیہ بیدار، رخشندہ نوید اور شاہدہ دلاور شاہ عمومی طور پر مشاعروں میں شریک ہونے سے گریزاں رہتی ہیں، مگر اس محفل میں شرکت کے لیے تشریف لے کر آئیں۔ نیلما ناہید درانی نے اپنی مقبول غزل سنائی:

اداس لوگوں سے پیار کرنا کوئی تو سیکھے
سفید لمحوں میں رنگ بھرنا کوئی تو سیکھے

راجا نیئر، غافر شہزاد اور سعود عثمانی نے بھی اپنا کلام پیش کیا اور خوب داد سمیٹی۔ کراچی سے زیب النساء زیبی بھی مشاعرے میں شرکت کے لیے تشریف لائیں، ساٹھ کتابوں کی مصنفہ اور ایک نئی طرز شاعری کی موجد کے کلام کو سامعین نے بہت پسند کیا۔ عباس تابش نے جب اپنی غزل سنائی تو داد و تحسین مشاعرہ گاہ کے ہر کونے سے آئی۔

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

حکیم ارشد شہزاد اور بابا نجمی نے اپنا پنجابی کلام پیش کیا۔ اختر شمار کی غزلوں پر حاضرین نے دل کھول کر داد دی۔ اقبال راہی، عزیر احمد اور شکیل راؤ نے بھی اپنی شاعری سامعین کی سماعتوں کی نذر کی۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے اپنا مزاحیہ شعری کلام پیش کر کے محفل کو کشتِ زعفران بنا ڈالا۔ خالد شریف نے جب اپنی غزل سنائی تو محفل کا رنگ دیدنی تھا۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

عطاالحق قاسمی مشاعروں میں شرکت سے آج کل احتراز کرتے ہیں، مگر اس مشاعرے میں خصوصی طور پر شریک ہوئے اور بھرپور شاعری سنا کر خوب داد سمیٹی۔ امجد اسلام امجدؔ نے جب اپنا کلام پیش کیا تو رات کا آخری پہر تھا مگر مشاعرہ گاہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور محفل گویا پھر جوبن پر تھی۔ انور مسعود نے مزاحیہ کے ساتھ ساتھ اپنا سنجیدہ کلام بھی پیش کیا جس پر انہیں ان کے معروف مزاحیہ کلام سے اگر بڑھ کر نہیں تو برابر داد ضرور ملی۔ رات کے تین بجے ظفر اقبال نے پڑھنا شروع کیا، مگر یوں گماں ہوتا تھا جیسے ابھی محفل جوان ہوئی ہے، تحسین اور داد کے ڈونگرے برسنے لگے۔ مشاعرے کے اختتام پر بھی اتنا زیادہ رش تھا کہ مہمانوں کو نکلتے نکلتے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ جب مہمان اس یادگار عالمی عید ملن مشاعرے کے بعد میاں چنوں سے رخصت ہو رہے تھے۔

مزاحمتی ادب اور تیز ہوا کا شہر

ادب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی پرانی بنی نوع انسان کی تاریخ ہے۔ بالفاظ دیگر انسان اورادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ادب میں مزاحمت کا سراغ پانے کے لئے کلاسیکی اصناف سخن پر تحقیق کرنے والے محققین کا اس نقطہ پر اتفاق ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی یہ اہلِ سخن کا محبوب موضوع رہا ہے۔زہر کا پیالہ پینے والے ارسطو کو پیغمبرِ عقل وخرد مانا جاتا ہے،اس کے خیالات ونگارشات بلا شبہ ادب میں داخل ہیں اور بلا خوفِ تردید ہم انہیں مزاحمتی ادب میں شامل کر سکتے ہیں۔جدید دور کی بات کریں تو مزاحمتی ادب میں ہمیں تنوع نظر آتا ہے۔متنوع مزاحمتی عناصر کی بنیاد جغرافیائی بھی ہے اور لسانی و ثقافتی بھی۔لاطینی امریکہ میں ہمیں پابلونرودا، گبریل گارسیا مارکیز،فریدا کاہلو،ڈیگوراویرااور گبریلا مسترال نظر آتے ہیں تو یورپ میں یکسر مختلف منظر نامہ نظر آتا ہے۔انگریزی ادب میں ایک بات ہے تو فرانسیسی ادب میں دوسری ، ہسپانوی ،اطالوی اور پرتگیزی زبان میں مزاحمت کے عناصر مختلف ہیں اور روس میں یہ بالکل الگ ہیں، جہاں سن 1917 کے بالشویک انقلاب نے مزاحمتی ادب سے ہی نمو پائی۔ برصغیر پاک و ہند میں مزاحمتی ادب کا منبہ ترقی پسند تحریک رہی اور اس سے منسلک انجمن ترقی پسند مصنفین نے ہی مزاحمتی ادب اور اس کے عناصر کے معیارات کے طے کیا۔ بائیں بازو کے مصنفین کی اپنی تصانیف اس بابت معتبر مانی جاتی ہیں،اس کے علاوہ عالمی سطح پر مزاحمتی ادب کو اس تحریک سے متاثر لو گوں نے اردو اور مقامی زبانوں میں ترجمہ اور شائع کروایا۔اب ہمارے پاس مزاحمتی ادب کے

عناصر جانچنے کے لئے ایک تو مقامی اہلِ قلم کی نگارشات ہیں اور دوسرا مذکورہ تراجم۔مزاحمت اوراس کے عناصر کا خیال میرے ذہن میں حال ہی میں شائع ہونے والی ایک کتاب کو پڑھ کرآیا ہے۔اس میں شامل افسانے مزاحمتی ادب کی ایک تازہ اور خوبصورت مثال ہیں۔

معروف شاعرہ، ادیبہ و دانشور نیلما ناہید درانی کی تازہ کتاب ''تیز ہوا کا شہر'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔اس دلچسپ اور منفرد کتاب کے تین حصے ہیں، پہلا سفرنامہ جوکہ آذربائیجان کے متعلق ہے جبکہ دوسرا حصہ مضامین پر مشتمل ہے اور تیسرے حصے میں افسانے شائع کئے گئے ہیں۔اس کتاب کے یہ تینوں حصے ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ اور معیاری تخلیقات کے حامل ہیں۔

128 صفحات پر مشتمل اس کتاب کوادارہ زربفت پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔خوبصورت سرورق پر آذربائیجان کے شہر باکو کی تصویر نظر آتی ہے اور پشت پر سابق پولیس آئی جی ناصرخان درانی نے اظہارخیال کیا ہے جو نیلما ناہید درانی کے فن اور شخصیت کے متعلق ہے۔یادرہے کہ نیلما خودبھی پولیس میں اعلیٰ افسر رہی ہیں۔لاہور میں ایس پی سپیشل برانچ کے علاوہ پولیس ٹریننگ سکول کی مدارالمہام بھی رہی ہیں۔افریقہ اور یورپ میں اقوام متحدہ کی امن فورس میں پاکستان کی کئی برس تک نمائندگی کرتی رہی ہیں۔کتاب کا دیباچہ طاہرانور پاشا نے لکھاہے جوکہ سابق آئی جی ہونے کے علاوہ بہت اعلیٰ سفرنامہ نگار ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ان کے علاوہ سلمیٰ اعوان کی معتبر رائے بھی شامل اشاعت ہے۔اعلیٰ کاغذ پر معیاری طباعت اور قیمت تین صدروپے ہے، جوکہ بے حد مناسب ہے۔

کتاب کا انتساب سال 2020اور COVID-19 کے نام کیا گیا ہے۔جس نے تمام دنیا کو گھروں میں قید کردیا۔انتساب دوم تاشقندازبکستان میں رہنے والی خاتون شہزودہ شہریار روناا ور مصنفہ کی جماعت ششم سے تاحال سہیلی صوفیہ تبسم جوکہ اب صوفیہ امجد میر کہلاتی ہیں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔سفرنامہ باکوآذربائیجان کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیاہے۔کتاب کا یہ حصہ سیاحت اورادب کا حسین امتزاج ہے۔اس کو پڑھ کرنہ صرف اس ملک کی تاریخ اور ثقافت سے آگاہی ملتی ہے۔بلکہ عمومی سماجی رویوں پر بھی مفصل اور غیر متعصب

معلومات حاصل ہوتی ہیں۔مضامین کے حصے میں کچھ شخصیات کے خاکے ہیں جن میں محسن نقوی،طارق عزیز،فضل محمود،عمران خان،مشیر کاظمی،صبیحہ خانم ،صدیقہ بیگم شامل ہیں۔آقای صادق گنجی کے متعلق ایک مضمون کے علاوہ مزاحیہ اداکاری کے بے تاج بادشاہ کے نام سے امان اللہ پر ایک تحریر اور مولانا آغا نعمت اللہ جان درانی پر بھی ایک مضمون شامل اشاعت ہے۔آخری حصے میں چھے افسانے اور اداکار عرفان خان مرحوم کے لئے ایک نظم شائع ہوئی ہے۔آخر میں جامعۃ الازہر قاہرہ یونیورسٹی مصر کے پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم کا تیز ہوا کا شہر اور نیلما کی شخصیت پر تبصرہ و تجزیہ شائع ہوا ہے۔نیلما ناہید درانی ان دنوں لندن میں مقیم ہیں مگر اس تازہ تحریر نے ان کی عدم موجودگی کے احساس کو ادبی حلقوں میں کافی حد تک کم ضرور کیا ہے۔

ارژنگ کا ارتقاء

وفاقی اردو جامعہ اسلام آباد کی طالبہ عاصمہ بیگم ماہنامہ ارژنگ پر ایم فل کی ڈگری کے لیے تحقیق کر رہی ہے۔ یہ ماہانہ علمی وادبی پرچہ میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر بائیس برس قبل اپنے زمانہ طالب علمی میں شروع کیا تھا جواب تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سارے سوالات ہیں جن کے جوابات یہ ذہین طالبہ چاہتی ہے۔ سوالات کا خلاصہ بیان کروں تو وہ بنیادی طور پر ارژنگ لاہور کا تعارف اور ارتقاء ہے۔ یہ موضوع ایسا ہے جس سے ہمارے بہت سارے قارئین کی کچھ نہ کچھ دلچسپی ضرور ہوگی۔ آج ہی مجھ سے میری مرحومہ دوست رخسانہ نور اور سید نور کی صاحبزادی قراۃ العین رینو پوچھ رہی تھی کہ ارژنگ کا مطلب کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ اردو زبان میں تصویری البم کو ارژنگ کہتے ہیں، گو کہ یہ لفظ ہمارے ہاں زیادہ مستعمل نہیں ہے مگر تصویروں کے مجموعے کے لیے فارسی اور اردو زبان میں یہی واحد لفظ ہے۔

تاریخی حوالے سے بات کریں تو تیسری صدی عیسوی میں ایران سے مانی ازم کے نام ایک مذہب کی ابتداء ہوئی، مانویت کے نام سے معروف ہونے والے اس مذہب کا بانی مانی نامی مصور اور نقاش تھا۔ اس نے تصاویر کی مدد سے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا۔ ان تصاویر کو کتابی شکل دی گئی اور اس کتاب کا نام ''ارژنگ'' رکھا گیا۔ وقت کے ساتھ مانی کا مذہب اور اس کی کتاب ''ارژنگ'' ناپید ہو گئی مگر تصاویر اور اریمیک زبان میں تحریر کردہ اس کتاب کا نام تاریخ کا ایک حوالہ بن گیا۔ یاد رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اریمیک زبان میں ہی گفتگو کیا کرتے تھے۔

تیسری صدی سے لیکر ساتویں صدی عیسوی تک عیسائیت کے مقابلے میں ایشیاء اور یورپ میں سب سے بڑا حریف مانی کا مذہب تھا۔ایک طرف چین اور دوسری طرف رومن سلطنت تک پھیلے ہوئے مانی کے مذہب کی ابتداء درحقیقت میسو پوٹیمیا،عراق میں ہوئی جو اس وقت ایران کے زیر نگیں تھا مگر ہمارا موضوع تو ''ارژنگ'' ہے،جس کی ایک محفوظ جلد افغانستان کے شہر غزنی سے تیر ہویں صدی عیسوی میں برآمد ہوئی۔

ارژنگ کے نام سے ایران اور آذر بائیجان کے علاوہ چین میں شہر بسائے گے۔ جو کہ آج بھی آباد ہیں۔چین میں تو ''ارژنگ'' کے نام سے مانی کی آرٹ گیلری بھی قائم کی گئی ہے۔فردوسی کے شاہنامہ میں ارژنگ کے نام سے ایک اہم کردار بھی ہے مگر 1999 میں جب میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر جن میں ابرار ندیم سرفہرست تھے اور تب وہ ابرار اسحر کہلاتے تھے،ارژنگ کے نام سے ادبی پرچہ نکالنا چاہا تو فردوسی کی بجائے منیر نیازی کا نام ہمارے ذہن میں آتا تھا جو اسی نام سے پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں اس نام سے پرچہ نکالتے رہے۔منیر نیازی سے ہماری بڑی قربت تھی اور ان کی میزبانی کا شرف بھی ہمیں بارہا حاصل رہا،اس معاملے میں ان کی آشیرباد ہمیں حاصل تھی۔سن 2000ء میں ہمیں ''ارژنگ'' کا ڈیکلریشن مل گیا جو ہمارے لیے نئ صدی کا تحفہ بھی تھا۔

ابتداء میں ارژنگ اخبار کی شکل میں شائع ہوتا تھا۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انٹرنیٹ ابھی اپنی ابتدائی شکل میں تھا،سوشل میڈیا کا وجود نہیں تھا۔ملک کے تمام اخبارات، چاہے وہ اردو تھے یا پھر انگریزی، ادب اور ادیبوں کو بس اتنی ہی جگہ دیتے تھے،جتنی آج کل دیتے ہیں۔ایسے عالم میں بڑے بڑے ادیب دنیا سے رخصت ہو جاتے اور لوگوں کو مہینوں بعض اوقات سالوں تک خبر نہ ہو تی تھی کہ ساقی فاروقی اب اس عالم رنگ و بو میں نہیں رہے ہیں۔ایسے عالم میں تازہ ادبی تخلیقات اور شاعری کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اہم ادبی خبروں کی اشاعت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہو ئے ہم دوستوں نے اس مشکل کام کا بیڑہ اٹھایا اور گزشتہ 22 سال سے ارژنگ لاہور مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

ان 22 برس میں دو اہم تبدیلیاں آئیں پہلی تبدیلی اخبار کی شکل سے ارژنگ کا کتابی صور

ت اختیار کرنا ہے۔ اس کا بنیادی محرک تو احمد ندیم قاسمی صاحب کا مشورہ تھا، جو ہماری ٹیم یعنی میرے، ابرار ندیم، ڈاکٹر صغرا صدف اور حسن عباسی کے لیے استاد کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا مشورہ تھا اخبار کی کوئی ''شیلف لائف'' نہیں ہوتی، اسے میگزین کی شکل دے دیں، زیادہ معتبر اور خوبصورت لگے گا۔ بلکہ انہوں نے تو ہمارے آٹھ صفحات کے اخبار کو اپنے ہاتھوں سے چونسٹھ صفحا ت کا میگزین بنا کر بھی دکھایا تھا۔ میں خود بھی محسوس کرتا تھا کہ ہمارے گھر کے کچن میں ''ارژنگ'' خا نسامائیں بطور تولیہ بھی کبھی کبھی استعمال کر لیتی ہیں، اور اس ناگہانی صورت حال میں مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا شرماتی بھی نہیں تھیں۔ اس بابت دوسرا محرک انٹرنیٹ کے خیرہ کن پھیلاؤ کے ساتھ سوشل میڈیا کی آمد تھا۔ اب کوئی خبر پوشیدہ نہیں رہتی، چاہے ہمارا مین سٹریم میڈیا اسے نظر انداز ہی کیوں نہ کر دے۔ اس لیے خبری ضرورت بڑی حد تک سوشل میڈیا نے پوری کرنا شروع کر دی تو ہم نے فیصلہ کیا کہ ارژنگ اب میگزین کی شکل میں شائع ہوگا اور تخلیقی ادب کی اشاعت اس کی ترجیح ہوگی، ثقہ ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھرپور موقع فراہم کیا جائے گا کہ اپنی تخلیقات قارئین کے سامنے پیش کریں۔

ارژنگ کے اس ارتقائی سفر میں دوسری بڑی تبدیلی ادارت کی تھی۔ بانی مدیر ابرار ندیم چونکہ ریڈیو کے پروڈیوسر ہونے کے علاوہ اور بھی براڈ کاسٹنگ کے لیے تخلیقی کام کرتے تھے، ان کی مصروفیت حد سے بڑھی تو انہوں نے ادارت ڈاکٹر صغرا صدف کے سپرد کر دی، ڈاکٹر صغرا نے بڑی محنت اور محبت سے چند سال ارژنگ کو شائع کیا مگر وہ بھی چونکہ پنجاب انسٹیٹیوٹ کی ڈائیریکٹر جنرل ہیں لہٰذا محکمانہ مصروفیت کے باعث باہمی مشاورت سے ہمدم دیرینہ اور خوبصورت شاعر حسن عباسی کو ارژنگ کی ادارت سنبھالنے کے لیے درخواست کی گئی۔ بعدازاں لبنیٰ صفدر نے مہربانی فرما کر مجلس ادارت میں شمولیت اختیار کر لی۔ جو گزشتہ کئی سال سے انتہائی محنت، لگن اور انہما ک سے ارژنگ لاہور شائع کر رہے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ پرانے مدیران بھی مجلسِ ادارت میں نہ صرف شامل ہیں بلکہ پرچے کی اشاعت میں بھرپور حصہ ڈالتے ہیں۔ ارژنگ کی باقی پوری ٹیم میں بھی بنیادی نقطہء اشتراک باہمی اور دوستی ہے، دراصل ہم سب آپس میں بہت گہرے، اور اب تو پرانے بھی ہوتے جا رہے ہیں، انتہائی قریبی دوست ہیں۔ معیاری شعروادب سے محبت اور

اس کی ترویج کا جذبہ ارژنگ لاہور کی ٹیم میں قدرِ مشترک ہے۔

سائیں، صاحب

معانی ومطالب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر الفاظ کا اپنا سحر ہوتا ہے۔لفظوں کا ترجمہ تو پھر بھی ممکن ہے،ان کے صوتی اثرات کے تراجم کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔دنیا بھر کی تمام زبانیں ایسے الفاظ کے خزانوں سے لبریز ہیں۔پاکستانی زبانوں پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔لسانی اعتبار سے پاکستان بڑا متنوع اور امیر ملک ہے۔اس جہانِ آب وگل میں چند ہی ممالک ایسے ہوں گے جہاں ہماری طرح سو کے لگ بھگ زبانیں بولی جاتی ہوں۔ہماری دھرتی کے لوگوں کا یہ امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے بیرونی دنیا سے آنے والوں کے ساتھ ہمیشہ وسیع المشربی کا مظاہرہ کیا۔کبھی کسی گروہ کو مجبور نہیں کیا کہ وہ اپنی زبان وثقافت سے دستبردار ہو جائے۔اسی سبب سے یہ لسانیاتی قوس قزح وطن عزیز میں وجود میں آئی ہے۔ثقافتی رنگارنگی کے علاوہ اس خطۂ ارض کے لوگوں نے خارجی زبانوں کے بارے میں بھی کبھی کوئی تعصب نہیں رکھا ہے۔کسی بھی زبان کا کوئی بھی لفظ اگر دل کو بھایا، بامعنی وبھرپور لگا تو اسے فوراً اپنا لیا۔عرب جب سندھ میں آئے تو اپنے ساتھ اسلام اور عربی زبان بھی لے کر آئے تھے۔اسلام کو من وعن وادیٔ سندھ کے اکثر لوگوں نے اپنا لیا،عربی زبان نے بھی اس خطے کی مقامی زبانوں پر بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔عربی لغت سے ہمارے روزمرہ میں آنے والا ایسا ہی ایک لفظ صاحب ہے۔یہ لفظ جب پنجاب پہنچا تو سیدھا پنجابیوں کے دل میں اتر گیا۔صوفیا کرام نے صاحب کا لفظ خدائے بزرگ و برتر کے لئے استعمال کیا ہے۔عظیم صوفی شاعر سلطان باہوؒ نے جیسے فرمایا:

جے باہو صاحب سر منگے ہرگز ڈھل نہ کریے ہو

ایک اور معروف صوفی بزرگ شاعر نے دیکھیں کس خوبصورتی سے صاحب کو مالک کائنات کے لئے استعمال کیا ہے۔

چنگی آں کہ مندی آں، صاحب تیری بندی آں

سکھ مذہب کے پیروکاروں نے اس لفظ کو تقدیس کے ایک نئے مرتبے پر فائز کردیا۔گرونانک کی تعلیمات پر مبنی اس دھرم نے ہر مقدس نام ومقام کے ساتھ ''صاحب'' کا لاحقہ لگا دیا ہے، جیسے ننکانہ صاحب ، گوردوارہ صاحب، گرنتھ صاحب، پنجہ صاحب آپ نے یقیناً سنے ہوں گے۔سندھی زبان کا لفظ سائیں، پنجابی زبان میں عربی سے آئے لفظ صاحب کی چوٹ کا ہے۔ویسا ہی مقدس اور خوبصورت ہے۔صاحب کی طرح سائیں بھی پروردگار عالم کے لئے استعمال کرتے ہیں۔سائیں اور صاحب کا ذکر ایک ساتھ کرنے کی وجہ خوبصورت لہجے کے مقبول شاعر حسن عباسی کے دو حمدیہ کلام پر مشتمل مجموعے ہیں۔جن میں ایک کا نام ''صاحب'' اور دوسرے کا نام ''سائیں'' ہے۔حسن عباسی سے میری دوستی کا سفر دو دہائیوں پر مشتمل ہے۔مگر باطن کا سفر تو ہر انسان کا الگ الگ ہی ہوتا ہے۔باطنی سفر میں تو انسان اگر کسی کو شریکِ سفر بنانا بھی چاہے تب بھی ہم سفر نہیں بنا سکتا۔ یہ ہر فرد کی اپنی تقدیر اور توفیق ہوتی ہے۔خالق و مالک کائنات کی ثناء بیان کرنا اور اتنی حمد کہنا کہ شعری مجموعہ بن جائے ، یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔سائیں اور صاحب اتنے خوبصورت نام ہیں کہ سیدھے دل پر اثر کرتے ہیں۔عربی زبان میں جس طرح لفظ مولا کے اٹھارہ مطالب ومعنی بیان کئے جاتے ہیں، جن میں بیک وقت دوست، ساتھی سے لے کر آقا وخادم تک بات جاتی ہے، بالکل ایسے ہی الفاظ سائیں اور صاحب ہیں۔ان سے ویسی ہی تقدیس چھلکتی ہے جیسی مولا کے لفظ سے اور مقدس لہریں پیدا ہوتی ہیں۔

یہاں آپ کو ایک دل چسپ بات بتاؤں کہ سندھی خواتین اپنے خاوند کو نام لے کر نہیں بلاتی ہیں، بلکہ سائیں کہہ کر مخاطب ہوتی ہیں۔پنجابی میں سائیں مالک کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے،علاوہ ازیں مجذوب شخص کے لئے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔البتہ سرائیکی زبان میں لفظ سائیں سندھی زبان جیسی گہرائی ، وسعت اور تقدس رکھتا ہے۔شوہر کو سرائیکی عورتیں بھی سائیں کہہ کر

پکارتی ہیں۔ بلکہ ''میڈا سائیں'' کے عنوان سے ایک مقبول کتاب بھی شائع ہوئی تھی۔ جو سرائیکی وسیب سے تعلق رکھنے والے ایک سیاست دان کی سابق اہلیہ نے تحریر کی تھی۔ گرچہ سائیں اور صاحب مجازی خدا کے لیے استعمال ہوتا آیا ہے۔ مگر ان الفاظ کا اصل مقام تو خدائے وحدہٗ ہو لا شریک کی ذات پاک ہی ہے۔ حسن عباسی کو حمدیہ کلام کے دونوں مجموعوں کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے ذاتی طور پر خوشی اس بات کی بھی ہے کہ میرے تخلیق کار دوست نے سائیں اور صاحب لفظ کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ رمضان المبارک کے بابرکت ایام میں الوہیت کی شعری نغمگی سے لبریز یہ دونوں کتابیں اہل ایمان کے لئے ایک خوبصورت تحفہ ہیں۔

حصّہ دوم

ترابِ آفتاب کا منظر

بازیچۂ سنگ وتذکرۂ جنگ

شام کے وقت گھر کے سامنے دریا کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے نوبت بجنے کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔اس کے ساتھ ہی نغمے کی مسحور کن آواز سنائی دی۔جاپان کے اس دور افتادہ قصبے میں شام کی خاموشی نے ان آوازوں کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ہم پنجابیوں کا مزاج ایسا ہے کہ ڈھول کی تھاپ جہاں سے بھی سنائی دے اسی جانب کھنچے چلے جاتے ہیں۔ہفتے کی نیم شب ویسے بھی عام معمول سے زیادہ فراغت اور آسودگی کا احساس دلاتی ہے۔اس لئے میں خراماں خراماں آوازوں کے منبع کی تلاش میں چل دیا۔ساز وآواز کا مرکز ایک بدھ مت کا قدیم معبد تھا۔مقامی زبان میں جنجا کہلانے والی اس عبادت گاہ میں کافی زیادہ گہما گہمی تھی۔کثیر تعداد میں معتقدین مرکزی ہال میں سٹول نما کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ان کے سامنے سٹیج پر روایتی جاپانی مذہبی لباس میں ملبوس پیشوا اپنی مناجات میں مصروف تھے۔ایک کونے سے بانسری بجنے کی آواز آرہی تھی۔کورس میں مذہبی گیت گائے جارہے تھے۔

لکڑی سے تعمیر کردہ یہاں کی روایتی بدھ اور شنتومت کی عبادت گاہوں میں عموماً دروازے نہیں ہوتے۔تالے کا تو خیر تصور بھی محال ہے کہ وہ تو روایتی گھروں میں بھی نہیں لگائے جاتے، چہ جائیکہ معبد کی تالہ بندی۔دیوار و در سے بے نیازی کے سبب چوبی ستونوں پہ کھڑا معبد کشادگی اور کھلے پن کا احساس دلاتا ہے۔اس مرکزی عمارت سے باہر نکلا تو پتھروں کے باغیچے کے پہلو میں جلتی ہوئی قندیلوں نے اپنی طرف متوجہ کیا۔زرد برقی قمقموں اور قندیلوں کی روشن قطاروں کے

ساتھ ساتھ سفید رنگ کے چارٹ لگے ہوئے تھے۔جن پر سیاہ برش سے اسمائے گرامی تحریر تھے۔یہ نام ان مرنے والوں کے تھے۔جن پر ماہ اگست کی پہلی شب دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں یعنی 1945ء میں امریکی فضائیہ کے لڑاکا طیاروں نے اتنی شدید بمباری کی تھی کہ وہ اگلی صبح کا سورج نہ دیکھ سکے۔ستائیس ہزار افراد یکم اگست کی رات لقمہ اجل بن گئے۔متاثرین کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔یاد رہے کہ اس شہر کی مجموعی آبادی بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔معبد کی مرکزی عمارت کے سامنے پتھروں کے باغیچے کے پہلو میں لوگ یہاں اپنے پیاروں کے نام تلاش کر رہے تھے۔حاضرین کی کثیر تعداد کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس تاریخی فضائی بمباری سے شہر کا شائد ہی کوئی گھر ہوگا جو اس ہولناک تباہی کے اثرات سے محفوظ و مامور رہا ہوگا۔

روایتی جاپانی لباس میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر خاتون بڑے ہی انہماک سے ان کاغذی قندیلوں پر تحریر نام پڑھ رہی تھی۔میرے استفسار پر کہ وہ کس کا نام تلاش کر رہی تھی؟ بتانے لگی کہ میرے دادا اس رات مارے گئے۔یہ ان کا نام درج ہے۔گپ شپ کے دوران اس نے بتایا کہ روشنی امید کا استعارہ ہے اس لئے یہ قمقمے روشن ہیں۔ایک سوال میرے ذہن میں وہاں ہاتھ سے بنی تصاویر دیکھ کر کلبلا رہا تھا۔بظاہر ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔کہیں پہاڑ کی تصویر ہے تو کہیں کسی جانور اور پرندے کی تصویر ہے۔کسی پینٹنگ میں چاول کی فصلیں نظر آرہی ہیں تو کہیں چاند اور چکور، میں نے مذکورہ خاتون کو اپنی الجھن بتائی کہ یا حبیبی! یہ ماجرا کیا ہے؟ادھیڑ عمر عورت نے سمجھایا کہ یہ تباہی سے پہلے کے مناظر ہیں۔مصور کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ ہنستا بستا، جیتا جاگتا شہر خاک وخون میں جو تبدیل ہو گیا تھا۔تباہی سے پہلے وہ کیسا تھا۔یوں کہیے کہ وہ کیا تھا۔جو دشمن نے خاکستر کر دیا۔اس دردناک رات اس شہر جسے تویاما کہتے ہیں، کا 99% حصہ منہدم ہو گیا تھا۔ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکی ایٹمی بمباری کے نتیجے میں مرگِ انبوہ کے سبب دنیا بھر کے لوگ آگاہ ہیں کہ اگست کی 6 اور 9 تاریخ کو چشم زدن میں ہی ان دو شہروں کے لاکھوں بے گناہ لوگ لقمہ اجل بن گئے۔مگر جاپان کے دیگر شہروں میں بھی دوسری عالمی جنگ کے بالخصوص آخری ایام میں نہتے عوام نے جس بربریت اور قیامت صغریٰ کا سامنا کیا، اسے ضبطِ تحریر میں لانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔آج جب جاپانی لوگ جنگ

کے خلاف اور امن کے حق میں بات کرتے ہیں تو اس کا بنیادی محرک یہی ہولناک مناظر ہیں۔ جن کا انہیں تجربہ ہوا۔ ایٹم بم کا گرنا تو نقطۂ عروج تھا۔ اس کے علاوہ بھی تباہی وحشت انگیز حدود کو چھوتی نظر آتی ہے۔

میں اور متذکرہ خاتون باتوں میں مشغول تھے کہ ''بازیچۂ سنگ'' یا پتھروں کے بازیچے سے معبد کا پروہت بھی ادھر آنکلا اور ہماری گفتگو میں شریک ہو گیا۔ جاپانی عورت سے پوچھنے لگا کہ آپ کا کون جاں بحق ہوا تھا؟ دادا کا ذکر سن کر پروہت نے خاتون سے اس کے دادا کا نام پوچھ لیا۔ خاتون نے اپنے دادا کا نام بتایا تو پروہت نے اس کے دادا کے تمام حالات زندگی ایک ہی سانس میں بیان کر ڈالے۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شائد خاتون کا دادا بزرگ کوئی مشہور آدمی گزرا ہوگا یا پھر پروہت کو تمام بمباری میں مرنے والے افراد کے کوائف حفظ ہیں۔ میرے دریافت کرنے پر خاتون نے بتایا کہ دادا بحری فوج میں فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ اس پہر میں پتھروں کے باغیچے یا ''باغِ حجر'' کی گہری اداسی میں ایک عجب طمانیت تھی۔

یہاں پتھروں کے باغیچے یا ''بازیچہ ءسنگ'' کی وضاحت کرنا بھی برمحل ہوگا۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے چونکہ سنگ سفید وسیاہ سے مزین ایسے باغ صرف جاپان میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا میں اور کہیں ان کی مثال نہیں ملتی۔ چشم تصور میں سبز باغ لائیے، اب اس باغ کی ہری گھاس کو سفید بجری سے تبدیل کر دیجئے۔ پتھروں کے باغیچے جسے پوری دنیا '' Stone Garden'' کے نام سے جانتی ہے۔ اس کی یہ سادہ ترین تفصیل ہے۔ ان پتھروں کے بازیچوں کی باقاعدہ دیکھ بھال ہوتی ہے۔ اور ان میں ایسے لکیریں ڈالی جاتی ہیں جیسے کھیت کھلیانوں میں ہل چلنے سے کیاریاں سی بن جاتی ہیں۔ ان سنگلاخ باغات کے باغبان اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ان میں کہیں کوئی جڑی بوٹی، سبزہ یا درخت نمو نہ پا جائے۔ ان پتھروں کے باغیچوں کی تاریخ پر ہم نظر ڈالیں تو یہ صدیوں بلکہ کئی ہزار سال پرانی روایت ہے۔ بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوا کرتی ہیں، استاذ الشعراء شہزاد احمد جن دنوں انجمن ترقی اردو کے صدر نشین تھے۔ تو ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ مجھے جاپانی ناول ''شوگن'' پڑھنے کا مشورہ دینے کے بعد، پوچھنے لگے کہ جاپان میں کیا اب بھی ''سٹون گارڈن'' ہوتے ہیں؟ یہ پہلا موقع تھا کہ میری

توجہ اس جانب مبذول ہوئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی بھی روایتی عبادت گاہ کے صحن اور گردو پیش میں آپ کو سبز باغ نظر آئے یا نہ آئے ، یہ بازیچۂ سنگ ضرور نظر آئے گا۔ معبدوں کے احاطے میں پتھروں کا بازیچہ لازمی خیال کیا جاتا ہے۔ یہ فقط روایت پسندی اور حسن پرستی ہی کا مظہر نہیں ہے بلکہ روحانیت سے اس کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ یہاں بتاتا چلوں کہ عموماً عبادت گاہوں کے پروہت، پجاری جب ان باغیچوں میں داخل ہوتے ہیں تو وہ ننگے پاؤں ہوتے ہیں۔ اندازہ کریں کہ پتھریلی نوکیلی بجری پر ننگے پاؤں چلنے کا تجربہ کیسا ہوگا؟ اسے روحانی بالیدگی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض نقاد اسے اذیت پسندی سے تعبیر کرتے ہیں اور Sadistic رویہ قرار دیتے ہیں۔ اہلِ سلوک کے نزدیک ننگے پاؤں پتھروں پر چلنا عبادت میں شمار اور روحانیت کی سیڑھی خیال کیا جاتا ہے۔ معرفت حق کے سفر کا ضروری حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر مصطفیٰ زیدی کے الفاظ میں مجاز کو حقیقت کے روپ میں ڈھال دیں تو،

انہی پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

بدھ بھکشو کئی کئی گھنٹوں تک خالی نظروں سے ''باغِ حجر'' کے پتھروں کو تکتے رہتے ہیں۔ ذہنی جنجال سے چھٹکارہ پانے کے لئے بھی ان پتھریلے بازیچوں کی زیارت کو نہایت مفید سمجھا جاتا ہے۔

خزاں کے رنگ

پت جھڑ کتنا خوبصورت لفظ ہے۔موسم کا نام ہونے کے ساتھ ساتھ اس رت کے دوران بیتنے والے قدرتی حالات وواقعات کو بھی بیان کر دیتا ہے۔جاپان کا چونکہ لگ بھگ (80%) اسی فیصد رقبہ پہاڑوں اور جنگلوں پر مشتمل ہے۔پہاڑ بھی سرسبز، درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔اسی لیے خزاں کی دستک سے جاپان کا رنگ بدل جاتا ہے۔جدھر نظر دوڑائیں، سبزے کی جگہ زردی اور نارنجی رنگ غالب ہوتا نظر آتا ہے۔

یہاں بہار کے جوبن پر جب چیری کے درختوں کی شاخیں پھول اٹھاتی ہیں تو ''چیری بلاسم'' دیکھنے کے لیے لوگ اہل خانہ اور دوستوں کے ہمراہ پھولوں سے لدے ان درختوں کے نیچے چٹائیاں بچھا کر، سامان خورد ونوش کے ہمراہ بیٹھ جاتے ہیں اور ایک تہوار ''ہنامی'' مناتے ہیں۔اسی طرح خزاں کے موسم میں بھی جب درختوں کے پتوں کا رنگ زرد، نارنجی اور سرخ ہونے لگتا ہے اور وہ پت جھڑ کی ہواؤں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں، تو بہت سارے جاپانیوں کے نزدیک یہ تہوار کا موقع ہے۔روایتی طور پر لوگ جوق در جوق گھروں سے نکلتے ہیں، اور فطرت کے قریب کہیں پناہ لیتے ہیں۔کہیں ٹولیوں کی شکل میں کسی پہاڑی پر پڑاؤ ڈالتے ہیں۔کہیں تنہا تنہا جنگل کا رخ کرتے ہیں۔دریاؤں کے کنارے بھی خزاں کے گرتے پتوں کی آہٹ سننے اور درختوں کے بدلتے رنگ دیکھنے کا مقبول مقام ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسے بہار میں چیری بلاسم کے تہوار کے لئے رائج لفظ ''ہنامی'' کا لفظی

ترجمہ پھول تکنا ہے۔خزاں کے رنگ بدلتے ،گرتے پتوں کا نظارہ کرنے کے لئے جانے کو ''زرد پتوں کا شکار کھیلنے'' کے لئے جانا کہتے ہیں۔یوں کہہ لیجئے کہ سوکھے پات دیکھنے جب لوگ پت جھڑ کے موسم میں گھر سے نکلتے ہیں تو ''مومی جگاری'' اسے کہتے ہیں۔ایک ہزار سال سے بھی پرانی شاعری میں اس تہوار کے تذکرے موجود ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی جسے یہاں ''نارا'' عہد کہتے ہیں،اس زمانے کی شاعری کا یہ محبوب موضوع ہے۔ہمارے ہاں فیض احمد فیض نے اسی موسم میں لکھی ایک معروف نظم میں پاکستان کو''زرد پتوں کا بن'' بھی کہا ہے۔چونکہ مستقل یہاں موسم خزاں کا راج دیکھتے تھے۔اور قانون کے نفاذ کے حوالے سے اس دیس کو جنگل محسوس کرتے تھے۔اسی لئے اسے درد کی انجمن بھی لکھتے تھے۔پسِ دیوارِ زنداں تحریر کردہ شاعری میں فیض کے کلام کا بہت نمایاں مقام ہے۔

خزاں کا رنگین اور دلکش منظر فقط فطرت کا کرشمہ نہیں ہے۔ان مناظر کی آبیاری بہت سے نیک دل لوگوں نے کی ہے۔اس کی ایک مثال ٹویوٹا کمپنی کی وجہ تسمیہ اور گاڑیاں بنانے والے اسی ادارے کے ہم نام شہر میں جو پت جھڑ کا حسین منظر نظر آتا ہے،اس نظارے کا سبب سترہویں صدی عیسوی میں ایک بدھ مت کے پیروکار اور معبد کے مہا پنڈت کے ہاتھوں سے لگائے گئے چار ہزار میپل کے درخت ہیں۔بدھ عبادت گاہ کے اردگرد کے علاقے میں پروہت کے لگائے گئے درختوں کے پتے خزاں کے موسم میں زمین پر زرد اور نارنجی چادر بچھا دیتے ہیں۔منظر کا حصہ بننے والے ان ادھ مڑے،زرد،خشک،نارنجی پتوں پر اگر پیدل چل کر دیکھیں تو احساس یہی ہوتا ہے۔جیسے کسی دبیز قالین پر قدم رکھ رہے ہیں۔

یہاں پر خزاں کا انتخابی نشان باقی دنیا کی طرح میپل کا پتا ہے۔میپل کو اردو اور فارسی میں ''افرا'' کہتے ہیں۔مگر میرا خیال ہے کہ قارئین کی اکثریت کے نزدیک ''افرا'' کی نسبت میپل زیادہ مانوس ہوگا۔گرچہ آج کل پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں افرا لڑکیوں کا مقبول نام ہے۔مجھے پروین شاکر کی شاعری سے یہ شکوہ رہتا تھا کہ وہ ان پھولوں اور پیڑوں کے استعارے استعمال کرتی ہے۔جو ہم نے کبھی دیکھے بھی نہیں ہیں۔ان کی شاعری میں رات کی رانی کی خوشبو کا تذکرہ ہو یا پھر املتاس کے پیڑ پر لگے پھول،کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔اسی

لیے مجھے شوکمار بٹالوی کا ''شرینہ دا پھل'' کے نام سے شعری مجموعہ دیکھ کر زیادہ اچھا لگتا اور سمجھ بھی آتی تھی۔ مگر واقعہ کچھ یوں ہوا کہ ایک حسین شام ایک باغیچے میں بیٹھے تھے۔ کہ کہیں سے بڑی دل آویز مہک ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی تو کسی نے بتایا کہ یہ رات کی رانی کی خوشبو ہے، پچھلے برس لاہور کے ایک رہائشی علاقے میں اہل خانہ کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے، اردگرد لگے درختوں کی بابت پوچھا، جن پر لدے، پھندے، پیلے رنگ کے پھول اپنے حسن سے مبہوت کئے جا رہے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ املتاس کے پیڑ ہیں، جن پر بسنتی رنگ کے پھول سجے ہیں۔ اس روز میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی بھی پھول اور پیڑ پرایا نہیں ہوتا۔

پہاڑی جنگلوں میں دور تک نکل جانے والے جاپانی لوگوں کے لئے سرخ اور ادھ مڑے پیلے پتوں کا مطلب، آنے والے تنہائی اور طویل موسم سرما کے دن ہیں۔ یاد رہے کہ شدید سردی اور برفباری کے باعث یہاں کے زیادہ تر علاقوں میں نقل وحرکت محدود ہو جاتی ہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں جانا تو خیر ممکن ہی نہیں رہتا ہے۔ سرما کی قید سے پہلے آزادی کے چند دنوں کا یہ جشن ہے۔ مگر حزن اور اداسی کے رنگ واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ تاریخی طور پر فقط مذہبی مقامات کے گردونواح میں پت جھڑ سے متعلق محفلیں ہوتی تھیں اور خصوصی عبادات کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ مگر اب مذہبی رنگ اس تہوار میں پھیکا پڑ گیا ہے، اور ثقافتی وسماجی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

شہزادی کی شادی

آج کل شہزادی کی شادی ذرائع ابلاغ کا یہاں محبوب موضوع بنا ہوا ہے۔ یہ وضاحت از بس ضروری ہے کہ شہزادی کی شادی سے میری مراد بشریٰ بی بی کی تحریک انصاف کے چیئر مین اور سابق کرکٹر عمران خان سے شادی نہیں ہے۔ روئے سخن جاپان کے شہنشاہ معظم اکی ہیتو کی بڑی پوتی شہزادی ماکو کی طرف ہے۔ جو کہ ایک عامی جاپانی لڑکے سے شادی کا ارادہ رکھتی ہیں، شاہی محل کے قانون وروایت کی رو سے شہزادی کو اس شادی کی پاداش میں شاہی خاندان سے بے دخل کر دیا جائے گا، چونکہ شاہی قوانین کے مطابق اہل قصر فقط شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ ہی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو سکتے ہیں۔ اگر شاہی خاندان کا کوئی فرد عام آدمی سے شادی کر لے تو اسے شاہی خاندان سے باضابطہ طور پر نکال دیا جاتا ہے۔ چونکہ ان دنوں پاکستان کی فضا ایسی بنی ہوئی ہے، جیسی کرکٹ کے بخار میں مبتلا ایام ہیں، آپ کسی سے اس کا حال، احوال پوچھیں تو جواب میں کرکٹ میچ کا تازہ ترین سکور بورڈ بتاتا ہے، ستر رنز پر پانچ آؤٹ ہو گئے ہیں،'' کوئی حال نہیں'' بالکل ویسے ہی آج کل شادی، بیاہ، نکاح کا ذکر کریں تو بات عمران خان کی بشریٰ بی بی سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے واقعے کی جانب رخ موڑ لیتی ہے۔

شاہی محل کے شعبہ اطلاعات ونشریات نے تازہ خبر اس بابت یہ جاری کی ہے کہ شہزادی ماکو کی شادی ملتوی کر دی گئی ہے۔ تمام قومی ومقامی اخبارات کے صفحہ اول پر چیختی، چنگھاڑتی شہ سرخیاں بتاتی ہیں کہ ولی عہد سلطنت کی بیٹی ماکو کی مجوزہ شادی اب 2020 میں ہوگی، اس التوا کی وجہ

شہزادی سے منسوب یہ بیان ہے کہ موجودہ حالات میں تجویز کردہ تاریخ پر شادی کے لیے ابھی تک مناسب تیاری نہیں ہو سکی تھی۔ اب وقت چونکہ کم رہ گیا ہے اور اس مختصر وقت میں انتظامات کرنا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ ان دو لائنوں کے بیان پر میڈیا میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔

چند باتیں اس بابت قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاہی خاندان سے متعلق میڈیا میں خبر کا عموماً فقط ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ شاہی محل کا شعبہ اطلاعات ہے، بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ شاہی خاندان کے کسی فرد یا واقعے کے متعلق کوئی خبر کسی دیگر ذریعے سے اخبارات یا ٹیلی ویژن کی زینت بنے۔ خبر کے الفاظ اور ان کی ترتیب تک تمام میڈیا میں ایک جیسی ہوتی ہے۔ اس احتیاط پسندی کی وجہ ابلاغیات کو لاحق کوئی خوف یا احساس ذمہ داری نہیں بلکہ بادشاہ کا احترام ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک جاپان کے شہنشاہ کو جاپانی قوم خدا کا اوتار مانتی تھی، اور اس کی باقاعدہ پوجا کی جاتی تھی۔ جنگ عظیم میں جب امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے اور جاپان شکست کھا گیا، تو اس ہزیمت کے بعد بادشاہ ہیروہیتو نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کیا، شکست کو کھلے الفاظ میں تسلیم کیا اور اعلان کیا کہ اس دن کے بعد وہ ایک عام انسان ہیں، خدا یا اس کے نائب نہیں ہیں۔ شہنشاہ کے لیے جاپانی جو لفظ استعمال کرتے ہیں وہ ''تھن نو'' ہے جس کا مطلب ''خدا جیسا'' یا پھر ''بھگوان سمان'' ہے۔ اب بادشاہ کی پرستش نہیں ہوتی، چونکہ اس نے خود ہی اعلان کر دیا کہ وہ لائق عبادت نہیں ہے مگر اب بھی اسے بے حد مذہبی تقدس حاصل ہے۔ عام جاپانی لوگوں کو مرنے کے بعد ہندوؤں اور سکھوں کی طرح بدھ مت اور شنتو عقیدے کے مطابق جلا دیا جاتا ہے، مگر شہنشاہ کی میت کو مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح دفن کیا جاتا ہے۔ برسبیل تذکرہ ہندوؤں میں بھی کسی مہاتما یا مہاپرش کو جلایا نہیں جاتا بلکہ زمین میں دفن کیا جاتا ہے۔

مذہبی تقدس اور بادشاہت کا یوں تو چولی دامن کا ساتھ ہے مگر جاپان کے سرکاری مذہب شنتو ازم کا تو مدار المہام ہی شہنشاہ معظم کی ذات تقدس ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ مذہبی طبقے اور حکمرانوں کی باہمی قربت کی وجہ آخر کیا ہے؟ مشرق کو تو چھوڑیے، مغرب کے دل اور جدید جمہوریت کی بانی ریاست برطانیہ کی ملکہ عالیہ کے تاج پر صلیب کا نشان بنا ہے اور ''Defender of faith'' یعنی ایمان کی محافظہ لکھا ہوا ہے۔ پورے یورپ میں جہاں جہاں شاہی محل ہوگا، اس کے

سامنے یا پھر برابر میں اتنا ہی پرشکوہ کلیسا ہوگا، بر سبیلِ تذکرہ شاہی قلعے کے سامنے بادشاہی مسجد کی شان وشوکت بھی اسی رابطہ کی عکاسی کرتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں ہم نے بارہا سنا ہے کہ ''اول الامر منکم'' کی اطاعت سے متعلق جو قرآنی آیات ہیں وہ ہمارے حکمرانوں کی اللہ اور رسول کے بعد اطاعت کرنے کی فرضیت کا حکم ہیں شاید اسی تناظر میں انقلابی شاعر فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ

ہر ایک اول الا مر کو صدادو کہ اپنی فرد عمل سنبھا لے
اٹھے گا جب جمع سرفروشاں پڑیں گے دارواسن کے لالے

دلچسپ بات ہے کہ جب جاپان اپنے ہمسایہ ممالک کو گزشتہ صدی کی ابتدا میں ان پر جنگ مسلط کر کے اپنی نوآبادی بنا رہا تھا، تب بھی اپنے اس عسکریت پسند جارحانہ عمل کی توجیح شہنشاہ معظم کے لیے کشور کشائی ہی تھی۔ فوجی مراسلوں اور ڈائریوں سے پتا چلتا ہے کہ سپاہی اپنے بادشاہ کی خوشنودی کے لیے سلطنت کو توسیع دینا چاہتے تھے۔ اس توسیع پسندی کا انجام اچھا نہ ہوا، باقی سب تاریخ ہے۔ شاہی محل کے ماحول اور عوام الناس میں اس کی تکریم میں ذرا برابر فرق نہیں آیا۔ اپنے طویل قیام کے دوران میں نے کسی جاپانی کے منہ سے شاہی خاندان کے متعلق تنقید کا ایک لفظ نہیں سنا، میں نے ہی کیا آج تک میں کسی ایسے آدمی سے زندگی میں نہیں ملا جس نے کبھی کسی جاپانی کے منہ سے قصرِ شاہی کے متعلق نازیبا یا ناگوار بات سنی ہو۔ بات ہو رہی تھی شہزادی ماکو کی شادی کے متعلق، شہزادی اور اس کے محبوب کی عمریں 26 سال ہیں، دونوں یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھتے تھے، وہاں پر ہی دونوں کی محبت پروان چڑھی۔ لڑکا وکیل بن گیا ہے اور یوکو ہاما میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہے۔ پروگرام تو یہ تھا کہ اسی برس چار مارچ کو دونوں کی منگنی ہوگی اور نومبر میں شہزادی محلوں کو لات مار کر ایک عام لڑکے سے شادی کر کے عامیوں کے درمیان زندگی گزارنے لگے گی، مگر شہزادی سے منسوب اس بیان نے اخبار نویسوں کے کان کھڑے کر دیے ہیں کہ اتنی جلدی بیاہ کے انتظامات ہونا ممکن نہیں لہذا اولمپک اور شہزادی کی شادی جاپانی ایک ساتھ یعنی 2020 میں دیکھیں گے۔ کچھ وہمی قسم کے لوگ سمجھتے ہیں کہ کبھی یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی، ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے۔ وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ سیدھی سی

بات ہے کہ شہزادی کی شادی ہے۔ دھوم دھام سے ہوگی۔ پوری دنیا سے مشاہیر آئیں گے۔ اب ایسے بڑے منڈل کو سجانے کے لیے وقت تو لگتا ہی ہے۔

موسم بدلا رُت گدرائی

چاول کی فصل جاپان میں تیار ہوگئی ہے۔آج کل کٹائی کا موسم ہے۔دیہی علاقوں کی فضا میں دھان کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔پہلی کٹائی کا اناج روایتی معبدوں میں دیوتاؤں کے حضور پیش کیا جاتا ہے۔ستمبر کا پہلا عشرہ اس بار سمندری طوفان کی تباہ کاریوں اور زلزلے کے نقصانات کی خبروں کے ساتھ گزرا مگر پھر بھی صدیوں پرانی ثقافتی اور مذہبی رسومات جو نئی فصل آنے کی خوشی میں منائی جاتی ہیں اپنے روایتی جوش وجذبے کے ساتھ جاری ہیں۔عبادت گاہوں کے ارد گرد کھانے، پینے کی اشیاء کے اسٹال سجے ہیں اور بچوں کی دلچسپی کا سامان بک رہا ہے۔ایسا سماں ہمارے ہاں میلوں ٹھیلوں میں نظر آتا ہو۔جیسے بزرگانِ دین کی درگاہوں پر عرس کے موقع پر رونق ہوتی ہے۔بالکل ویسی ہی گہما گہمی دیہی جاپان میں ان دنوں عبادت گاہوں کے اطراف نظر آتی ہے۔

جاپان ایک صنعتی معاشرہ ہے،مگر ثقافتی اعتبار سے اس کی سماجی بنیادیں زراعت کے شعبے سے جڑی ہوئی ہیں۔جس طرح قدیم ہندوستان کا معاشرہ چار ذاتوں میں بٹا ہوا تھا، جو بڑی حد تک انسان کا پیشہ بھی طے کرتی تھیں، جس میں برہمن کھشتری، ویش اور شودر تھے۔اس سے ملتی جلتی صورتحال ہمیں قدیمی جاپانی معاشرے میں بھی نظر آتی ہے۔یہاں بھی سماج کی چار پرتیں، درجے یا ذاتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔بھارتی سماج میں برہمن بھگوان کے سر سے پیدا ہوئے سمجھے جاتے تھے اور شودر ذات کا جنم بھگوان کے پاؤں سے ہوا۔اسی عقیدے کی بنیاد پر برہمن

مذہبی شعبے کے انچارج ہزاروں سال سے ہیں، کھشتر ی جنگجو تھے،حفاظت اور جنگ ان کا پیشہ، ویش کاروبار کرتے تھے۔ جبکہ شودر ناپاک سمجھے جاتے مگر مزدوری یہی کرتے تھے۔ جاپان میں یہ تقسیم تو موجود تھی مگر اس قدر ظالمانہ نہیں تھی۔ جیسے ہندوستانی معاشرے میں تھی۔ یہاں اس تقسیم کی بنیاد کام کی تقسیم تھی۔ کسی انسان کی توہین وتذلیل مقصود نہ ہوتی تھی۔

یہ چار سماجی درجے کچھ یوں تھے۔ بادشاہ اور اس کے خاندان کو پہلا اور سب سے بلند درجہ حاصل رہا ہے۔ دوسرے درجے پر سمورائی اور ان کے جنگجو سپاہی ہوتے تھے۔ تیسرے درجے پر کسان تھے، کھیتوں میں کام کرتے اور سادگی سے زندگی بسر کرتے۔ کاروباری لوگ سماجی درجے بندی میں چوتھے اور آخری درجے پر سمجھے جاتے تھے۔ بادشاہ اور اسکے خاندان کو مذہبی تکریم ہمیشہ سے حاصل تھی اور اب تک ہے۔ بادشاہ کو صرف حکومتی اختیار کی بنیاد پر قابل احترام نہیں جانا جاتا بلکہ اسے زمین پر خدا کا اوتار مانا جاتا تھا۔ خدا کا نائب یا خلیفہ ہونا ایک مختلف بات ہے۔ جاپانی بادشاہ کو خدائے مجسم اور زندہ جاوید خدا مانا جاتا تھا، اسکی پوجا کی جاتی تھی، عام لوگوں کو ہندوؤں اور سکھوں کیطرح مرنے کے بعد جلایا جاتا ہے، جبکہ بادہ شاہ کو زمین میں دفن کیا جاتا ہے۔ البتہ موجودہ بادشاہ اکی سہتو نے وصیت کی ہے کہ اسے عام جاپانیو کی طرح جلایا جائے۔ دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد بادشاہ نے ریڈیو پر اعلان کر دیا تھا کہ وہ اب خدا یا اس کا کوئی اوتار نہیں ہے۔ مگر پھر بھی عوام میں صدیوں سے جیسی اس کی تکریم تھی، ویسی ہی اب بھی ہے۔

سمورائی یوں تو ایسا موضوع ہے کہ اس پر سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مگر مختصر بیان کریں تو یہ طبقہ بادشاہ کے وفا دار جاگیرداروں اور جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ پورا جاپان ان جاگیرداروں میں تقسیم تھا، ان کے اپنے قلعے اور مسلح افواج تھیں ان کی تعداد اگر ہزاروں میں نہیں تو سینکڑوں میں ضرور تھی۔ سمورائی طبقے کے علاوہ کسی کو تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ قانون یہ تھا اور سماج میں تسلیم شدہ حقیقت بھی کہ سمورائی کے علاوہ کوئی بہادر نہیں ہوسکتا۔ اب سماج میں فقط سمورائی طبقے کے خاندانی نام باقی ہیں، سماج میں ان کا پیشہ ختم ہو چکا ہے۔ دوسری تبدیلی یہ آئی ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد اب کاروباری طبقے کو کسان طبقے سے زیادہ اہمیت اور تکریم حاصل ہوگئی ہے۔ میرے جاپانی دوست کھوگو کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ کسی بھی آدمی کا خاندانی نام جان کر بتا

سکتا ہے کہ وہ تاریخی اعتبار سے سمورائی طبقے سے ہے، کسان پیشہ یا پھر کاروباری خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ بادشاہ کے خاندان کا نام بالکل علیحدہ ہے مگر شاہی خاندان بھی نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ایسے خاندانی ناموں کی کل تعداد پانچ سو کے قریب ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہر شہری ان پانچ سو خاندانی ناموں کی فہرست میں سے اپنی مرضی کا نام چن سکتا ہے۔ باالفاظ دیگر اپنی ذات خود چن سکتا ہے۔

مجموعی طور پر جب کوئی غیر ملکی شہری جاپانی شہریت اختیار کرتا ہے تو اسے ان پانچ صد خاندانی ناموں میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے اپنے نام کا لاحقہ بنانا ہوتا ہے۔ میرے جاپانی دوست کھوگوسان کا مشورہ ہے کہ اگر میں جاپانی شہریت کبھی اختیار کروں تو مجھے سمورائی نام رکھنا چاہئے۔ میں اسے ہمیشہ تسلی دیتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا، حاسدین نے میرے دوست کے بارے میں مشہور کر رکھا ہے کہ وہ آدھا پاگل ہی نہیں پورا چریا ہے۔ یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ ہر نام کے آخر میں جاپانی لوگ ''سان'' کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لفظ ''سان'' صاحب یا سائیں کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہر نام کے ساتھ لاحقے کے طور پر اس کا استعمال ضروری ہے۔ اس ''سان'' کے بغیر کسی کا نام پکارنا سنگین بدتمیزی شمار کیا جاتا ہے۔ مثال سے واضح کروں دھوبی صاحب، مکینک صاحب، نائی صاحب، ڈرائیور صاحب، بھائی صاحب، چاچا صاحب، خالہ صاحبہ، بشیر صاحب، یہ روایتی مشرقی معاشرہ ہے، ادب، آداب اور رکھ رکھاؤ کا یہاں پر بہت زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔

عطر فروشوں کی زبان میں بات کی جائے تو جاپان کی فضا نیوٹرل ہے۔ عمومی طور پر ہوا میں کسی بھی طرح کی کوئی مہک، خوشبو یا بدبو آپ کو نہیں آئے گی۔ یہ ایام مگر خصوصی ہیں۔ مضافاتی علاقے تازہ دھان کی مسحور کن مہک سے معطر ہیں۔ جس طرح پنجاب میں گندم کی کٹائی کے موقع پر ''وساکھی'' کا روایتی تہوار منایا جاتا ہے، اس دیس میں چاول کی کٹائی کے موقع پر تیوہار کا منظر نظر آتا ہے۔ گلی گلی سے جلوس نکلتے ہیں۔ مذہبی اور ثقافتی جوش و جذبے کے ساتھ نکلنے والے ان جلوسوں کے شرکاء روایتی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ آگے آگے نوبت بجتی ہے اور ڈھول کی تاپ پیچھے پیچھے بچے ہونٹوں سے بانسری لگائے سُر بکھیرتے جاتے ہیں۔ نعرے بلند کئے

جاتے ہیں۔ان جلوسوں کے آگے کوئی نہ کوئی خوفناک شکل والا بھوت نما فلیٹ ہوتا ہے یا کسی جانور کی شبیہ بڑے سائز میں اہل علاقہ نے تیار کی ہوتی ہے۔اس بابت میں نے سوال کیا تو جواب ملا کہ یہ بدروحوں کو ڈرانے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ان جلوسوں کی منزل قریب ترین معبد ہوتے ہیں۔وہاں دعا کر کے شرکاء گھروں کا رخ کرتے ہیں۔محرم کے ایام عزا میں تعزیے کے جلوس اور ربیع الاول میں عید میلا دالنبی کے جلوس سے ملتی جلتی تصویر آج کل یہاں کے مضافاتی علاقوں کی سڑکوں پر نظر آرہی ہے۔

ایٹمی بمباری اور سونامی کے بچوں پر اثرات

چند سال پہلے جاپان میں زلزلے اور سونامی کے نتیجے میں جو تباہی ہوئی تھی، اس خوفناک حادثے نے یہاں کے بچوں کو کیسے متاثر کیا؟ نونہالوں کے مزاج اور شخصیت پر سونامی اور اسکے نتیجے میں برپا ہونے والی بربادی نے کیا اثرات مرتب کئے ہیں؟ پشاور سے تعلق رکھنے والی ہماری دوست خانم تسنیم قزلباش نے مجھ سے یہ سوال پوچھتے ہوئے، افغانستان کے بچوں کی مثال دی۔ خانم کا کہنا تھا کہ ان کی بیٹی پشاور اسپتال میں ڈاکٹری کی ہاؤس جاب کررہی تھی۔ جن دنوں کابل اور گردونواح سے تقریباً روزانہ کی بنیاد پر زخمی پشاور لائے جاتے تھے۔ ان زخمیوں میں اکثر بہت سارے بچے بھی ہوتے تھے۔ زیادہ تر واقعات میں شدید زخمی ہوتے تھے، چونکہ معمولی زخمیوں کو تو افغانستان کے اندر ہی ابتدائی طبی امداد کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ شدید زخمی حالت میں جب یہ بچے اسپتال لائے جاتے تو وہ بالکل خاموش ہوتے تھے۔ ذرا بھی رونا دھونا نہیں کررہے ہوتے تھے۔ خانم کی ڈاکٹر بیٹی بتاتی ہیں کہ جب ان بچوں کو ڈرپ یا انجیکشن لگایا جاتا تو ذرا بھی حرکت نہیں کرتے تھے، نہ تڑپتے، بے چین ہوتے اور نہ ہی روتے۔ مکمل طور پر خاموش۔ کھلی آنکھوں سے یہ سب کچھ پرسکون حالت میں دیکھتے رہتے تھے۔ اپنے زخموں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتے رہتے بالکل بھی احتجاج یا چوں چراں نہیں کرتے اور نہ ہی روتے تھے۔ مکمل سکوت کا عالم ہوتا تھا۔ خانم کا یہ مشاہدہ اور سوال سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس حیرت کی وجہ حیران کن حد تک ایٹمی بمباری اور سونامی سے متاثر ہونے والے بچوں کی

افغانستان سے آئے زخمی بچوں کے ساتھ مماثلت ہے۔ناقابل یقین حد تک ایٹمی بمباری کے مرگِ انبوہ اور سونامی سے متاثرہ بچے بھی پیہم خاموش رہے۔ بلکہ سالہا سال تک انہوں نے ان واقعات کے متعلق اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔کوئی احتجاج نہ شکایت مکمل خاموشی۔خاص طور پر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ہونے والی امریکی ایٹمی بمباری کے عینی شاہدین اور متاثرین بچے تو کئی دہائیوں تک اپنی زبان پر ایک لفظ بھی اس واقعے کے متعلق لے کر نہیں آئے۔ بہت سارے بچوں نے تو اپنی قوتِ گویائی ہی کھو دی، ہمیشہ کے لئے۔کئی مگر ایسے تھے جنہوں نے دس سال بعد، بعض نے بیس سال بعد اور بہت ساروں نے تو پچاس سال کے بعد اس واقعے کے متعلق اپنی زبان کھولی اور تفصیلات بیان کی ہیں۔اگست 1945 میں ہونے والی امریکی ایٹمی حملوں کے بارے میں حال ہی میں ایک بزرگ نے اس واقعے کے ستر سال گزرنے کے بعد ایک کتاب لکھی ہے جس میں اپنی یاداشتیں پیش کی ہیں۔جس میں ہیروشیما پر ایٹم بن گرایا گیا۔ایک بچے کی آنکھ نے دیکھا کہ ایک جیتا جاگتا شہر کیسے آگ کے گولے میں تبدیل ہو گیا، مصنف نے شہر سے باہر دریا میں چھلانگ لگا کر جان بچائی کہ اس کے علاوہ تو ہر چیز ایٹم بم کے شعلوں نے جلا کر بھسم کر دی تھی۔ ماؤں کی جلی لاشوں سے لپٹ کر روتے ہوئے بچے، خون میں لتھڑے جا بجا خون تھوکتے ہوئے لوگ۔

سونامی تو لفظ ہی جاپانی زبان کا ہے، بعدازاں پوری دنیا میں بلند سمندری لہروں اور طوفان کے ساحل سے ٹکرانے کے اس عمل کو پورے عالم میں اسی نام یعنی ''سونامی'' کے طور پر اپنا لیا گیا۔بنیادی طور پر سمندر کے پیندے اور فرش پر زلزلے کے جھٹکوں سے سطح سمندر پر اٹھنے والی بلند لہروں کو سونامی کا نام دیا جاتا ہے۔جاپان میں چند برس پہلے آنے والے اس سونامی سے زیادہ خوف میں مبتلا کرنے والی چیز فوکوشیما کے ایٹمی پلانٹ سے تابکاری کے اخراج اور دھماکے کے خدشے سے پیدا ہونے والی بے چینی اور تذبذب تھا۔یہ ایٹمی پلانٹ سونامی کے نتیجے میں شہر کے ساتھ ہی پانی میں ڈوب گیا تھا۔اس سارے واقعے کی بنیاد مگر زلزلہ تھا۔سسمیک سکیل پر اس کی شدت 9 ڈگری تھی۔جس متعلق نذر جان کاکڑ نے مجھ سے استفسار کیا تھا کہ کتنے سی سی کا زلزلہ ہے؟ اس وقت ہم ری کنڈیشن گاڑیوں کے ایک آکشن ہاؤس میں بیٹھے تھے۔جب ہمیں اذن ملا

کہ تمام لوگ باہر کھلی جگہ پر چلے جائیں۔اور بتی چلی گئی۔زمین جھول رہی تھی۔تبھی میں نے کہا کہ یوں لگتا ہے جیسے دھرتی رقص کررہی ہے۔اس پر نذر جان لالہ کا کہنا تھا کہ ماڑا! تم پکا کیمونسٹ ہے۔کوئی خداخوفی کرو۔اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ کس عظیم تباہی نے دستک دے دی ہے۔گرچہ سونامی چند شہروں تک محدود اور ایٹمی اخراج کا معاملہ بیس کلومیٹر کے دائرے میں وقوع پذیر ہوا۔مگر نفسیاتی طور پر پوری قوم اور دنیا کے دیگر ممالک پر اس کے دیرپا اثرات تھے۔بے گھری کا شکار ہونے والے بچوں پر اس کے اثرات کا جائزہ لینے کے لئے بہت ساری سرکاری اور غیرسرکاری تنظیمیں اب تک تحقیق کررہی ہیں۔دوسری جنگِ عظیم میں ایٹمی بمباری کا شکار ہونے کے بعد یہ جاپانی تاریخ کی دوسری بڑی تباہی تھی۔جس کا سامنا کرنا پڑا۔ان دونوں سانحات سے متاثر ہونے والے بچوں میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ پیہم خاموشی ہے۔اتنی بڑی تباہی اور ہولناکی دیکھ کر بچے رونا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔مجھے یہاں نوبل انعام یافتہ شاعرہ گبریلا مسترال کی ایک نظم یاد آرہی ہے۔جس کا میں نے ہسپانوی سے براہ راست اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔نظم کا عنوان ''اس کا نام آج ہے''۔

اس کا نام آج ہے۔ہم بہت سی غلطیوں اور خرابیوں کے ذمے دار ہیں مگر ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے بچوں کو نظرانداز کررکھا ہے،زندگی کے چشمے کو بھلا رکھا ہے۔بہت سی چیزیں جن کی ہمیں ضرورت ہے،انتظار کرسکتی ہیں۔مگر بچے انتظار نہیں کرسکتے ہیں۔یہی وقت ہے جب اس کی ہڈیاں بن رہی ہوتی ہیں،اس کا خون بن رہاہے اور اس کے حواس خمسہ تشکیل پا رہے ہوتے ہیں۔اس کو ہم یہ جواب نہیں دے سکتے کہ ''کل'' کیونکہ اس کا نام ''آج'' ہے۔

والدین بے خبر ہیں

ماں باپ کو کوئی خبر نہیں ہے۔ یہ اعلان نما بیان کسی نگری کا نام بھی ہوسکتا ہے۔ اور نگر بھی کوئی معمولی نہیں بلکہ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے اسے عالمی ورثہ قرار دے رکھا ہے۔ میں جاپان کے عین وسط میں واقع ''اویاشی رازو'' شہر کا تذکرہ کررہا ہوں۔ فطرتی حسن سے مالا مال یہ خطہ زمین ارض وسماء سے ماورا معلوم ہوتا ہے۔ ہماری دھرتی کا حصہ تو بالکل معلوم نہیں پڑتا۔ یوں گماں ہوتا ہے کسی اور ہی سیارے پر آ گئے ہیں۔ یہ ایک ایسا اساطیری شہر ہے۔ سمندر کے کنارے بلندو بالا چٹانوں کے درمیان ایک چوٹی پر ٹھیک پچاس سال پہلے ایک پارک تعمیر کیا گیا تھا۔ آپ اسے ''درشن باغ'' کہہ سکتے ہیں۔ دور دراز سے آئے سیاح اس چھوٹے سے پارک میں کھڑے ہوکر قدرت کے اس شاہکار کا نظارہ کرتے ہیں۔ جاپان کی سب سے بلند چٹان اپنے پورے شکوہ کے ساتھ ایستادہ یہاں سے سامنے نظر آتی ہے۔

والدین نہیں جانتے ہیں نامی اس علاقے کا نام کیسے پڑا؟ یہ ایک تاریخی واقعہ اور دردناک کہانی ہے۔ قصہ بارہویں صدی عیسوی کا ہے، مگر ہزار سال گزرنے کا باوجود آج بھی موجود ہے۔ ایک جنگجو سردار اپنے مخالف قبیلے سے لڑتے ہوئے جنگ ہار گیا۔ اس تاریخی معرکے میں متذکرہ جنگجو سورما کا قبیلہ تہہ تیغ کردیا گیا۔ یہ اپنی بیوی کے ساتھ بڑی مشکل سے جان بچا کر پسپا ہوگیا۔ میدان جنگ سے فرار ہوکر یہ سورما اپنی بیوی اور ننھے بچے کے ساتھ ٹھیک اسی مقام پر پہنچا جو ہماری گفتگو کا موضوع ہے۔ یہاں ایک طرف ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اور اس کی غصیلی

لہریں تھیں تو دوسری طرف بلند و بالا پتھریلی چٹانیں اس ساحل کو آپ دنیا کے خطرناک ترین ساحلوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ چٹانوں سے سر ٹکراتی لہریں جھاگ سے ساحل کو ڈھانپے جاتی ہیں۔ جب شکست خوردہ جنگجو سردار اور اس کی بیوی اپنے بچے کے ساتھ اس مقام سے گزر رہے تھے تو ساحل پر ان کا ننھا بچہ کھو گیا۔ اس کمسن کے غائب ہونے اور لہروں میں بہہ جانے پر غم زدہ ماں نے ایک مختصر سی نظم لکھی، یہی نظم اس شہر کی وجہ تسمیہ بنی۔

والدین کو کچھ پتہ نہیں
اس ساحل کی لہروں پر ایک بچہ
جھاگ میں غائب ہو جاتا ہے، کوشن جی راہ کنارے

اس دکھ بھری داستان اور نظم کی یاد میں پچھلی صدی کی ابتداء میں ایک نامور سنگ تراش نے ممتا کے جذبے کو اجاگر کرنے والا ایک مجسمہ تراشا۔ قد آدم کے اس شہہ کار فن پارے میں خاتون نے ایک بچہ گود میں اٹھا رکھا ہے، جبکہ اس کا دوسرا بچہ ماں کی ٹانگ کو تھامے کھڑا ہے۔ ماں اور بچے کی نگاہیں چٹانوں کی سمت اٹھی ہوئی ہیں۔ یہ مجسمہ درشنی باغ میں نصب کیا گیا ہے۔

جاپان جزیروں کا جھرمٹ ہے جن کی تعداد 6853 ہے۔ مگر ان میں سے بڑے جزائر چار ہیں۔ یہ چار جزائر ملک کے مجموعی رقبے کا 97 فیصد ہیں۔ جیسا منظر مذکورہ علاقے کا ہے۔ یہی جاپان کا عمومی لینڈ سکیپ ہے۔ ملک کا 73 فیصد رقبہ پہاڑوں، جنگلوں یا ایسے علاقوں پر مشتمل ہے، جہاں کاشکاری ممکن نہیں، نہ ہی صنعتیں ہیں اور نہ ہی آبادی ممکن ہے۔ اس دیس کی آبادی بقیہ 27 فیصد رقبے پر ہی آباد ہے۔ یہ علاقہ صدیوں سے اپنی نوکیلی چٹانوں کی خطرناکی اور ساحلوں کی تندی کے سبب مشہور رہا ہے۔ جدید شاہراہوں کی تعمیر کے بعد اب یہ راستے ویسے خطرناک نہیں رہے۔ کافی کشادہ سڑکیں بن گئی ہیں۔ اور بل کھاتی خونخوار چٹانوں اور گہری گھاٹیوں کی جگہ سرنگوں نے لے لی ہے جو پہاڑوں اور چٹانوں کے اندر سے گزر جاتی ہیں۔

مجھے جس چیز نے اس خوبصورت علاقے کے سفر کے لئے تحریک دی، وہ عہد ساز جاپانی صوفی شاعر اور سفر نامہ نگار ماتسو باشو کی شاعری اور نثر میں ''والدین نہیں جانتے ہیں'' میں ان کے قیام کا تذکرہ ہے۔ سترھویں صدی عیسوی کے اس صوفی منش شاعر اور ادیب کی تخلیقات کا ترجمہ

دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے،۔سندِ قبولیت بھی حاصل کر چکا ہے۔میری نظر میں باشومولانا روم اورعمر خیام کے پائے کا شاعر ہے۔خیال،فنی پختگی اور گہرائی کے اعتبار سے وہ دنیا کے بڑے شعراء کرام کی فہرست میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ کچھ عرصے سے ماتشو باشو کی شاعری کا پنجابی زبان میں ترجمہ کرنے کا کام کررہا ہوں۔تصوف کا رنگ اس کے کلام میں غالب ہے۔ برصغیر پاک وہند میں ایسی شاعری کی مثال تلاش کرنا چاہیں تو سچل سرمست کو پڑھ لیں۔سچل اور باشو کی شاعری کا رنگ بڑی حد تک ایک جیسا ہی ہے۔اپنے شہرہ آفاق سفرنامے میں باشو نے اس علاقے کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔یہاں پراس کا قیام ایک سرائے میں تھا۔اسی سرائے میں اس نے ایک لافانی ہائیکو لکھی۔ یہ ہائیکو عالمی ادب کا قیمتی حصہ سمجھی جاتی ہے۔آپ بھی پڑھیے اور سر دھنیئے کہ اتنے کم الفاظ میں ایسی بڑی باتیں کیسے کی جاسکتی ہیں۔سرائے کا منظر ذہن میں رکھئے۔

ایک ہی چھت کے تلے
طوائفیں بھی سوتی ہیں
جنگلی گھاس اور چاند

ویسے تو جاپانی زبان میں ’’اویاشی رازو‘‘ عقب داڑھ کو بھی کہتے ہیں مگر یہ غیر رومانوی سی بات ہے۔بہتر ہے کلام تمام کرتے ہیں۔

صحافی خود خبر نہ بنیں

تصور کریں کہ ہمارے ملک کے کسی معتبر اخبار کا کوئی نامور اخبار نویس کسی جنگ زدہ علاقے میں صحافتی ذمہ داریاں ادا کرتا ہوا اغوا کر لیا جائے۔ اغوا کار اسے کئی سال تک حبسِ بے جا میں رکھیں۔ برسوں کی اذیت کے بعد وہ داعش جیسی کسی دہشت گرد تنظیم سے رہائی پا کر پاکستان واپس آئے تو ہمارے تاثرات ایسے اخبار نویس کے بارے میں کیا ہوں گے؟ ہمارا میڈیا اس واقعے کو کیسے نشر کرے گا؟ اس صحافی اور اس کے اہل و عیال کا بیانیہ کیا ہوگا؟

میرا خیال ہے کہ ہمارا عمومی تاثر مثال میں پیش کئے گئے خبر نگار کے بارے میں یہی ہوگا کہ وہ بڑا مظلوم ہے۔ دہشت گردوں کے زیرِ عتاب رہ کر اس نے صحافت کے لئے بڑی قربانی دے دی ہے۔ اس شخص کی جرأت اور بہادری کو سلام پیش کریں گے۔ میڈیا میں ایسے اخباری رپورٹر کو ہیرو کے طور پر پیش کیا جائے گا، جس نے عین میدانِ جنگ میں رپورٹنگ کا بیڑا اٹھایا۔ اس راہ حق میں دہشت گردوں کے ساتھ نبرد آزما رہ کر سرخرو ٹھہرا۔ خود اس مثال کا صحافی غالباً اس کارنامے پر اعلیٰ صحافتی اقدار کا حوالہ دیکر اور دیگر اچھی اچھی باتیں کر کے ہمارے دل گرمائے گا۔ اس کے عزیز و اقارب ایسے ہیرو صحافی پر فخر کا اظہار کریں گے۔ کیا کیا جائے کہ یہاں واقعہ تو ہو بہو ویسا ہی پیش آیا ہے جیسی میں نے فرضی مثال دی، مگر جاپان میں اس واقعے کا ردِ عمل یکسر مثال کے برعکس نظر آیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ ہفتے جاپان کا معروف صحافی جمپے یاسوداشام سے رہائی پا کر جاپان

پہنچا ہے۔ تین سال پہلے اسے دہشت گرد تنظیم داعش نے ایک کاروائی کے دوران حلب کے قریب سے اغوا کرلیا تھا۔ مذکورہ صحافی شام اور عراق کے موضوع پر کئی کتابوں کا مصنف ہے، اس کے تجزیے اور تبصرے مستقل قومی اخبارات میں شائع ہوئے اور ٹیلی ویژن پر اس کی رپوٹیں اکثر نشر ہوتی تھیں۔ ٹوکیو پہنچنے پر اس کے والدین اور بیوی نے اس کا استقبال کیا۔ میرے لئے حیرانی یہاں سے شروع ہوئی۔ اس صحافی نے میڈیا سے بات کرتے ہوئے ایک تو یہ کہا کہ گزشتہ تین سال سے زائد عرصہ جو اغوا کاروں کی قید میں اس نے گزارا ہے وہ جہنم سے بھی بدتر تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کہا کہ میں قوم سے معافی مانگتا ہوں کہ میں نے ایک مشکل اور پریشانی کھڑی کردی تھی۔ مگر آپ سب لوگوں کا بہت شکریہ، آپ کی بدولت میں بحفاظت واپس وطن پہنچ گیا ہوں۔ مذکورہ صحافی کا یہ واحد بیان ہے جو میڈیا پر نشر کیا گیا۔ قومی اخبارات کے اندورنی صفحات پر رہائی اور وطن واپسی کی خبر شائع ہوئی ہے اور اس پر تبصرے بھی۔ میرے لئے یہ معذرت اس لئے بھی حیرت کا سبب بنی چونکہ اس سے پہلے اسی صحافی کی بیوی بھی میڈیا کے سامنے معافی مانگ چکی ہے، کچھ عرصے کی بات ہے جب اس نے اپنے خاوند کے سبب ملک میں پیدا ہونے والی پریشانی پر معذرت طلب کی۔ اگلی حیرت میرے لئے یہ تھی کہ جاپانی وزیرِاعظم نے متذکرہ صحافی اور اس کے خاندان کو ملاقات کے لئے وقت دینے سے صاف انکار کردیا تھا۔

سوشل میڈیا پر شام سے رہائی پاکر پہنچنے والے اس صحافی پر بے رحم تنقید ہو رہی ہے۔ اس کے رویے کو غیر ذمہ دارانہ، غیر شائستہ اور غیر پیشہ ورانہ قرار دیا جارہا ہے۔ معاشرے کو نقصان پہنچانے اور صحافتی اقدار کی پامالی کا اس پر الزام لگایا جارہا ہے۔ میرے لئے یہ صورتحال سمجھنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ شائد میرا اپنا بھی ''میڈان پاکستان'' ہونا ہے۔ ایک پڑھے لکھے دوست سے اس موضوع پر میں نے رجوع کیا، کہ آخر مذکورہ صحافی کی غلطی کیا ہے؟ کیوں اسے معافی مانگنی پڑ رہی ہے؟ معاشرہ کیوں اس پر غصے کا اظہار کررہا ہے؟ جبکہ اس نے کوئی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی ہے، بلکہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض ادا کررہا تھا۔ میرے اہل علم دوست کا کہنا

تھا کہ پہلی غلطی تو اس نے یہ کی ہے کہ وہ اس علاقے میں جا پہنچا جہاں پر جانے سے جاپانی حکومت نے اپنے شہریوں کو منع کر رکھا تھا۔اس صحافی کا شام جانے کا مقصد چاہے جو بھی ہو مگر اس نے حکومت کی جانب سے جاری کردہ ہدایات کو نظر انداز کیا ہے، یہاں یہ تذکرہ برمحل ہوگا کہ جاپانی معاشرے میں کوئی بھی طبقہ اور کسی بھی پیشے سے منسلک فرد یا افراد کسی خصوصی سلوک کے مستحق نہیں ہوتے ہیں۔ یہ صرف الفاظ نہیں ،اس ملک کی بڑی اہم زمینی حقیقت ہے۔کسی کو کوئی استثنیٰ نہیں، کسی بھی صورت حال میں۔ دوسری اہم بات جو شعبہ ابلاغیات سے منسلک میرے اس فاضل دوست نے بتائی وہ بہت اہم ہے،اس کا کہنا ہے کہ صحافی کو کسی بھی صورت میں خود خبر نہیں بننا چاہیئے ،اخبار نویس کا کام خبر ڈھونڈنا ہے،اور خبر شائع کروانا ہے، بذات خود خبر بننا صحافتی اقدار کے منافی رویہ ہے۔یہی دو بنیادی وجوہات ہیں جن کی بناء پر ہی حال ہی میں رہائی پانے والے جاپانی صحافی کی اپنے وطن میں پذیرائی نہیں ہوئی بلکہ اسے معذرت خواہانہ رویہ اپنانا پڑا۔فلسفے کے شعبہ سے منسلک تو شیرو تیرادا جو کہ صوفیہ یونیورسٹی ٹوکیو میں پڑھاتے ہیں،ان کا ایسے صحافیوں کے متعلق کہنا ہے کہ ''وہ تو بے چارے مظلوم ہیں،ان سے کوئی غلطی نہیں ہوئی مگر پھر بھی انہیں معافی مانگنا پڑتی ہے،حالانکہ انہوں نے کسی قانون شکنی کا ارتکاب نہیں کیا ہوتا،مگر پھر بھی قصوروار گردانے جاتے ہیں، چونکہ یہ معاشرے کی ذہنیت ہے کہ ایسے صحافی سماج کو نقصان پہنچاتے ہیں،لہٰذا قصوروار ہیں۔اس واقعے سے ایک چیز تو پاکستانی صحافیوں کو ضرور سیکھنی چاہیئے ،وہ یہ کہ صحافی کو خود خبر نہیں بننا چاہئے۔

جاپانیوں کی دیانت داری

کل لاطینی امریکہ کے ایک دور افتادہ ساحل کنارے ریستوران میں جاپانی سماج گفتگوگا موضوع تھا۔جنوبی امریکہ میں پلے بڑھے میرے ان دوستوں کے لئے جاپان ایک حیرت کدہ تھا۔کان کنی کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ایک مقامی دوست نے مجھ سے استفسار کیا کہ سنا ہے جاپان میں کھیتوں اور باغات کے کنارے پھل اور سبزیاں رکھ دی جاتی ہیں،ان پر قیمت کا پرچہ آویزاں کیا جاتا ہے ،اور پیسوں کے لیے ایک ڈبہ رکھ دیا جاتا ہے۔لوگ آتے ہیں،پھل،سبزیاں خریدتے ہیں اور قیمت کے پیسے ڈبے میں ڈال کر چلے جاتے ہیں۔حالانکہ دوکان دار کوئی بھی نہیں ہوتا مگر لوگ چوری نہیں کرتے اور بددیانتی کا مظاہرہ بھی نظر نہیں آتا،کیا یہ بات سچ ہے؟

میں نے اثبات میں جواب دیا کہ یہ بالکل صحیح منظرکشی ہے اور ماجرا بھی سارا سچ ہے۔ میرا جواب سن کر یہ دوست کہنے لگا کہ یقین کرواگر یہی پھل ،سبزی کا اسٹال یہاں چلی میں کسی کھیت کنارے ہوتو چند منٹوں کے اندر پھل اور پیسوں کا ڈبہ،دونوں غائب ہو جائیں گے۔ بات صرف چلی کی نہیں ایسا منظر جاپان کے علاوہ شاید آپ کو دنیا کے کسی بھی کونے میں نظر نہ آئے۔یہ وجہ نہیں کہ باقی دنیا چوروں پر مشتمل ہے، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ من حیث القوم شاید جاپانی باقیوں سے زیادہ دیانتدار ہیں۔گرچہ جزوی وجہ یہ بھی ہے کہ جاپان میں مزدور کی یومیہ اجرت 15 ہزارروپے ہے،اس لئے تھوڑے سے پھل،سبزیاں بیچنے کے لئے کوئی آدمی پوری دیہاڑی

نہیں بیٹھنا چاہتا،اس کے باوجود کوئی کسان اپنا اسٹال لگا کر،اس پر پھل،سبزیاں سجا کر قیمت کا اشتہار لگا تا ہے،تو پیسوں کا ڈبہ وہاں رکھ کر جاتے ہوئے اسے یہ یقین کامل ہوتا ہے کہ جب وہ شام ڈھلے واپس آئے گا تو پیسوں کا ڈبہ اور بچے ہوئے پھل وہاں پر ضرور موجود ہوں گے۔یہ یقین بھی ہوگا کہ کوئی مفت بر پھل سبزیاں اٹھا کرنہیں لے گیا ہوگا۔جاپانی سماج میں چوری کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔روایتی مکانات میں تو گھر کی کنڈی ہی دروازے پرنہیں لگی ہوتی،تالے کے لئے تو جگہ ہی نہیں ہوتی اس لئے سوال ہی پیدانہیں ہوتا۔

دلچسپ معاملہ ہے کہ یہاں دنیا کی قدیم ترین تہذیب ''ان کا'' کی زبان اب بھی بولی جاتی ہے جسے ''کیچوا'' کہتے ہیں۔پیرواس آٹھ ہزار سال پرانی تہذیب کا مرکز تھااور بولیویا کے بھی زیادہ تر حصوں میں یہ زبان ابھی تک رائج ہے۔''کیچوا''زبان میں سلام کچھ یوں کیا جاتا ہے''آمایویا،آماکھویا،آماوویا''۔جس کا اردوزبان میں ترجمہ یوں ہوگا کہ ہم بزدل نہیں،ہم سست الوجودنہیں،اور ہم چورنہیں ہیں۔مخالفین کا مگراصرار ہے کہ اس مقامی ''چھولونسل '' جسے عرف عام میں ریڈانڈین کہا جاتا ہے،اس نسل میں تینوں خرابیاں پائی جاتی ہیں،یہ بزدل بھی ہیں،سست الوجود بھی ہیں اور سب کے سب چور بھی ہیں۔یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارا اسلام ''تم پر سلامتی ہو'' کے معنی ومطالب رکھتا ہے مگر مخالفین کہتے ہیں کہ ہم دنیا بھر میں لوگوں کے گلے کاٹتے پھرتے ہیں۔اقوام کے باہمی تعلقات کی تاریخ ان کے ایک دوسرے کے بارے میں تاثرات اور تعصّبات طے کرتی ہے۔پس جب ایک پاکستانی کی نظر سے لاطینی سماج کو دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے تمام رنگ ہی خوبصورت لگتے ہیں،قوس قزح کی طرح دلکش،خوبصورت روایات اورانسانیت پرست،محبت کرنے والے لوگ۔یہ الگ بات کہ دیانتداری کا معیار یہاں زیادہ بلندنہیں ہے۔

جاپانی سماج میں ایمانداری اور دیانت کی وجوہات پرغور کریں تواس کی وجہ صرف تاریخ، قانون اورثقافت نہیں بلکہ تربیت بھی ہے۔بچوں کوشروع سے سکول میں پڑھایا جاتا ہے کہ اگرآپ کوسڑک پر یا پھر کہیں بھی سرِ راہ کوئی قیمتی چیز لاوارث پڑی ملتی ہے تو اسے اٹھا کر جیب میں نہیں ڈال لینا، بلکہ قریب ترین پولیس اسٹیشن میں جمع کروانا ہے۔جاپان میں مقیم ایک پاکستانی دوست کا بیٹا،جو تیسری جماعت میں پڑھتا ہے،ایک دن مسجد میں مجھے اس بابت اپنے تجربات بتا رہا

تھا، ایک دفعہ اس نے پولیس اسٹیشن جا کر 100 روپے کا سکہ جمع کروایا جو اسے سڑک پر پڑا ملا تھا۔ پھر ایک دن اس کے ہم جماعت اور وہ سکول سے گھر جا رہے تھے کہ انہیں پانچ سو روپے سڑک پر پڑے ملے، تمام ننھے طلباء نے وہ پیسے اٹھا کر قریب ترین پولیس اسٹیشن کا رخ کیا ڈیوٹی پر معمور پولیس اہلکار نے بڑی توجہ سے ان طلباء کی بات سنی، اس واقعے کی مکمل رپورٹ درج کی اور پانچ سو روپے طلباء سے لے کے سرکاری خزانے میں جمع کرنے کے بعد تمام طلباء کا شکریہ ادا کیا، پولیس اسٹیشن کے دروازے پر ان طلباء کو فرشی سلام کر کے تھانیدار نے رخصت کیا۔ یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ 100 یا پھر پانچ سو جاپان میں انتہائی معمولی رقم ہے، اس کے کرنسی نوٹ بھی نہیں ہوتے، فقط سکے ہوتے ہیں، پولیس اہلکار اپنے انہماک اور سنجیدگی سے بچوں کو یہ درس دے رہا تھا کہ وہ ایک بہت اہم کام سرانجام دے رہے ہیں، جو بے حد پسندیدہ بھی ہے۔ یہی بچے ملک وقوم کا مستقبل ہیں۔ شاید یہی بچپن کی تربیت کا اثر ہے کہ دنیا میں گمشدہ سامان اور متاع کے واپس ملنے کی سب سے زیادہ شرح جاپان میں ہے۔

روزمرہ کی ایک بات بتا دوں کہ آپ کا بٹوہ یا پھر پرس کہیں گم ہو گیا ہے تو غالب امکان یہی ہے کہ وہ آپ کو صحیح سلامت واپس مل جائے گا۔ میرے ایک جاننے والے نئے نئے پاکستان سے ہجرت کر کے جاپان آئے تو اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ جاپانی معاشرے کی خامیوں کی نشاندہی کرتے رہتے تھے۔ پھر ایک دن ان کا پرس گم ہو گیا۔ بہت ساری قیمتی اور اہم دستاویزات کے علاوہ قابلِ ذکر مقدار میں نقدی بھی اس بٹوہ میں موجود تھی۔ اب صبر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، سو وہ اسی کوشش میں تھے کہ غم غلط کیا جائے۔ شام 7 بجے کے قریب گھر کی گھنٹی بجی دروازہ کھولا تو دو پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ پہلے تو مذکورہ ہم وطن پاکستانی گھبرا گیا، مگر جلد ہی ہ گھبراہٹ خوشی میں بدل گئی، جب پولیس اہلکاروں نے بٹوہ نکال کر دکھایا اور پوچھا کہ کیا یہ آپ کا ہے؟ کسی شہری نے تھانے آ کر ہمیں جمع کروایا ہے۔ اپنا گمشدہ بٹوہ جسے دوبارہ پانے کی کوئی امید نہ تھی، پولیس سے وصول کر کے خوشی سے نہال، اپنے ہم مشرب پاکستانی دوستوں سے پوچھنے لگا، کہ یار! کیا یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے؟ ایمان اور کفر کی بحث میں اترے بغیر عرض کرتا چلوں کہ بددیانت شخص کو اہلِ پنجاب بے ایمان کہتے ہیں، اور دیانت دار شخص پنجاب میں ایماندار کہلاتا ہے۔

ذاتی تجربہ اس ضمن میں یہ رہا کہ ایک شام ریستوران سے کھانا کھا کر نکلتے ہی زمین پر ایک بٹوہ پڑا ملا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، بٹوہ کھولا تو کسی لڑکی کا ڈرائیونگ لائسنس اور کچھ پیسے اس کے اندر نظر آئے۔ ہم پنجاب پولیس کے دہشت زدگان تھانے کے نام سے ذرا گھبراتے ہیں، لہٰذا ارد گرد نظر دوڑائی کہ شاید کوئی اور یہ نیکی کمانا چاہے اور تھانے جا کر بٹوہ جمع کروائے۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ پولیس سے ایک باعزت فاصلہ رکھتے ہوئے میں واپس ریستوران کے استقبالیے پر پہنچا اور انہیں بٹوہ تھما دیا کہ تمہارے دروازے پر پڑا ملا ہے۔ بیرے نے مجھ سے لیکر بٹوہ کاؤنٹر کے اندر رکھ دیا، کہنے لگا کسی گاہک کا ہوگا، امید ہے کہ ڈھونڈتا ہوا ادھر آ نکلے گا۔ بصورت دیگر میں خود پولیس اسٹیشن جا کر جمع کروا دوں گا۔ بات کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ روزمرہ کا یہ کس درجہ معمولی واقعہ ہے۔

جاپان کے ایک دوردراز ساحلی شہر میں بندرگاہ کے قریب ایک بڈھے کو پریشان دیکھا۔ جھنجھلایا ہوا، ادھیڑ بن میں اپنی کشتی کے اردگرد چکر لگا رہا تھا۔ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا، میں نے پوچھا بابا جی کیا ماجرا ہے؟ کہنے لگا کچھ سمجھ نہیں آ رہی!! میں نے زور دے کر پوچھا، بزرگوار کیا سمجھ نہیں آ رہی؟

بڈھا کہنے لگا کہ صبح جب میں اپنی بوٹ چھوڑ کر گیا تھا تو یہ بالکل درست تھی۔ ابھی ابھی واپس آیا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اس کا انجن غائب ہے۔ میں نے ادھر ادھر بھی دیکھا ہے کہ کہیں گر نہ گیا ہو، مجھے قریب قریب بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ صبح تو بالکل اسٹارٹ تھا، پھر کدھر چلا گیا؟ غالباً کوئی روسی بحری جہاز کا اہلکار اس کا انجن اتار کر لے گیا تھا، چونکہ قریب ہی روسی

بحری جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں۔ میں نے جاپانی بڈھے کی مشکل آسان کرتے ہوئے اسے سمجھایا کہ بابا جی! آپ کی بوٹ کا انجن چوری ہو چکا ہے۔ میری بات سن کر بڈھے نے حیرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگا ہیں!!! وہ کیسے؟ وجہ اس حیرت کی یہ تھی کہ شاید پوری زندگی میں اس بزرگ کا پہلی بار کسی چور سے واسطہ پڑا تھا۔ اسی لئے اس کو چوری کی واردات کی تفہیم اور رموز سمجھنے میں دشواری کا سامنا تھا۔

بیک پیکر صحافی

جاپان میں لفٹ مانگنے کا رواج بالکل بھی نہیں ہے۔ایک عشرے سے زائد عرصے پر محیط اپنے قیام کے دوران میں نے یہاں فقط دو مرتبہ کسی کو لفٹ مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔پہلی دفعہ ایک پہاڑی سلسلے کے دامن میں واقع موٹروے کے سروس ایریا کے کنارے کھڑے شخص کو ہاتھ میں لفٹ کی درخواست کا سائن بورڈ پکڑے دیکھا،اس دن غالباً میں بوجوہ جلدی میں تھا،نظرانداز کر کے گزر گیا۔اس مرتبہ اسی ڈھنگ سے سڑک کنارے کوہ پیماؤں جیسا بیگ پشت پر لادے ایک نوجوان کو لفٹ مانگتے دیکھا تو میں رک گیا۔شدید سردی میں برفانی لمبے کوٹ کے باوجود یہ لڑکا ٹھٹھر رہا تھا۔سچی بات مگر یہ ہے کہ میں صرف انسانی ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر اس طالب علم کو اپنی گاڑی میں لفٹ دینے پر آمادہ نہیں ہوا تھا،بنیادی محرک شاید اس نایاب مخلوق کی کہانی جاننا بھی تھا۔آخر یہ فقید المثال کون ہے جو اس دیس میں لفٹ مانگ رہا ہے جہاں شاید اکثریت کو اس درخواست کے مفہوم سے بھی آشنائی نہیں،کیا یہ ممکن ہے کہ جیب میں ٹکٹ کے پیسے نہیں ہیں تو آدمی اس طریقے سے بھی منزل تک پہنچ سکتا ہے؟مغربی دنیا میں لفٹ مانگنا بہت عام سی بات ہے،اور اس طریقے سے مفت سفر کرتے ہوئے بیک پیکرز بھی آپ کو روز سڑک کنارے انگوٹھے کے اشارے سے،ساتھ لے جانے کی درخواست کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مشرقی روایات اور شرمیلے پن کے سبب عمومی طور پر جاپانی لفٹ نہیں مانگتے ،میرا گمان تھا کہ یہ آدمی کوئی خاص ہوگا۔اس کی کہانی ذرا الگ ہوگی۔میرا شک درست نکلا۔یہ نوجوان

طالب علم یونیورسٹی میں صحافت کے آخری برس کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ تجربے اور ذہنی وسعت کے لئے یہ جاپان کے آخری کونے سے بذریعہ سڑک مختلف لوگوں سے لفٹ لیتا ہوا، یہاں تک پہنچا تھا۔ میری کار میں بیٹھتے ہی اس نے شکریہ ادا کیا اور ٹیپ ریکارڈر آن کرتے ہوئے کہنے لگا، آپ کی اجازت سے میں یہ گفتگو ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتا، میں نے گاڑی حرکت میں آتے ہی اس سے پوچھ لیا کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ یہاں کیسے پہنچا؟ نوجوان بڑے شائستہ لہجے میں بولا کہ میں ہوکائیدو سے آرہا ہوں، جو کہ جاپان کا آخری کنارہ ہے اور انتہائی سرد علاقہ ہے، یہاں تک وہ بیس لوگوں سے لفٹ لے کر پہنچا تھا، ہمارے پنجابی محاورے کے مطابق ''خجل خوار'' ہو کر مذکورہ مقام پر مجھ سے ملا تھا۔

سفر کا سبب جان کر البتہ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ گزشتہ تین دن سے اس سفر کے دوران مختلف لوگوں کے انٹرویو لیتا آرہا تھا، میں اکیسواں ڈرائیور تھا جس سے وہ سوالات کر رہا تھا اور تاثرات ریکارڈ کر رہا تھا۔ یہ انٹرویو وہ ریڈیو پوڈ کاسٹ پر نشر کرتا ہے۔ یہ جان کر مجھے مزید حیرت ہوئی کہ یہ اس کی یونیورسٹی کی کوئی اسائینمنٹ نہیں تھی بلکہ ذاتی شوق کے سبب وہ یہ کٹھن سفر کر رہا تھا۔ صحافت کا مصدر صحیفہ ہے، اور صحافی فاعل ہے، انگریزی میں جرنلزم، جرنل اور جرنلسٹ بھی اسی مفہوم کے حامل ہیں، میں نے اس نوجوان صحافی کے جذبے کی تعریف کرتے ہوئے یہی بات اس کے سامنے رکھی کہ ریڈیو پوڈ کاسٹ کو کیا یہاں صحافت مانا جاتا ہے؟ کہنے لگا کہ الیکٹرانک میڈیا اور بالخصوص انٹرنیٹ کی آمد سے بہت کچھ گڈ مڈ ہو گیا ہے۔ یوشیدا نامی اس نوجوان کا مزید کہنا تھا کہ اب صحافت کو دنیا بھر میں میڈیا کے ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے، اپنے سفر کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ ذہن کی وسعت اور عملی میدان کی بہتر آگاہی حاصل کرنے کے لئے اس نے رخت سفر باندھا ہے۔ راستے کی مشکلات اور موسم کی شدت کے بارے میں اس سے پوچھا تو کہنے لگا کہ یہاں کے لوگ بہت رحم دل اور اچھے ہیں۔ مجھے لفٹ کے لئے زیادہ وقت تک انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ ریڈیو پوڈ کاسٹ یا پھر بلاگ کو صحافت کہنے میں مجھے ذرا تامل ہے، بنیادی اعتراض میرا یہی ہے کہ ہر دو صورتوں میں ایڈیٹر کا وجود نہیں ہوتا۔ ذاتی طور پر میں مدیر کو ایک ادارہ سمجھتا ہوں اور اس کے بغیر شائع یا نشر ہونے والا مواد صحافت کے زمرے میں نہیں آتا۔ یوشیدا کا معاملہ اور مسئلہ بالکل

ہی الگ ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ عام روزمرہ زندگی میں کوئی جاپانی بات کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا، ریڈیو انٹرویو کا نام سن کر تو وہ ایسے پھسلتا ہے جیسے گیلے ہاتھ سے مچھلی پھسلتی ہے، مگر جب کوئی شخص گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہیں جارہا ہو اور آپ اس کے ہمسفر بن جائیں تو پھر بات کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ پاکستانی صحافت اور سماج سے لیکر ہمارے رسم ورواج تک اس نے مجھ سے ایسے ایسے سوال پوچھے جو مجھ سے زندگی میں آج تک کسی نے نہیں پوچھے۔ تین گھنٹے کی اس بات چیت کے اختتام پر اس نے میرے ساتھ سیلفی بنانے کی فرمائش کر دی، اس کے بعد کہنے لگا کہ کیا میں یہ انٹرویو اپنے پوڈ کاسٹ ریڈیو انٹرنیٹ چینل پر نشر کرسکتا ہوں، تصویر بھی شائع کر سکتا ہوں۔ میں نے بخوشی ہاں! کر دی۔

جس طرح شاعری میں موزونیت بنیادی شرط ہے، عروض، قافیہ، ردیف شاعر وقت کے ساتھ ساتھ سیکھ لیتا ہے، اسی طرح صحافی ہونے کی بنیادی شرط بھی صحافتی رویہ ہے، باقی الفاظ کا چناؤ اور اصول وضوابط وقت کے ساتھ آتے رہتے ہیں، مگر یوشیدا میری بات سے متفق نہیں تھا۔ اس کا ماننا ہے کہ جب وہ عملی میدان میں اترے تو اس کی مکمل تیاری ہونی چاہیے۔ نیم حکیم خطرہ جان۔ اس کے نظریات سن کر اور جذبہ وشوق دیکھتے ہوئے میں نے اس کے روشن مستقبل کی ضمانت دے دی۔ میری بات سن کر کہنے لگا کہ فی الحال تو وہ پارٹ ٹائم ایک میوزیکل گروپ کے سٹاف کے طور پر نوکری کرتا ہے، جہاں ان کا کنسرٹ ہو مجھے ساتھ بلا لیتے ہیں، صبح کے وقت تو یونیورسٹی میں پڑھنا ہوتا ہے ، والدین کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا والد محترم نے گھر سے نکال دیا ہے، کہتے ہیں کہ بیس سال عمر ہوگئی ہے ، اپنا کماؤ اور اپنا کھاؤ۔ سفر کے خاتمے پر میں نے اسے ایک سستے کرائے والے ہوسٹل کے سامنے اتار دیا، اس کی بکنگ پہلے سے اس نے دوران سفر کروالی تھی۔ یہاں وہ چند دیگر مسافروں کے انٹرویو کرنے کی کوشش کرے گا۔ گاڑی کی پچھلی نشست سے اپنا بیک پیک بستہ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا کہ میں نے پاکستان کے متعلق بہت عجیب باتیں سن رکھی

تھیں،مگرآپ لوگ تو بڑے نرم خو، ہمدرد اور اچھے دل والے ہیں۔ یہ سن کر میری شام حسین ہوگئی۔

صدرٹرمپ کا دورہ جاپان

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا حالیہ چار روزہ دورہ جاپان کئی اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل رہا۔ یاد رہے کہ جاپان میں نئے شہنشاہ کا عہدہ اسی ماہ مئی میں آغاز پذیر ہوا ہے۔ بتیس سال تک حکمرانی کرنے کے بعد اکی ہیتو نے رضا کارانہ طور پر اپنا عہدہ چھوڑ دیا ہے، نئے شہنشاہ نارو ہیتو سے ڈونلڈ ٹرمپ کسی بھی بیرونی ملک سے آ کر ملنے والے پہلے سربراہ مملکت تھے۔ شاہی استقبالیہ تقریب اور عشائیہ غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ گر چہ جاپان میں بادشاہ کا عہدہ بھی برطانیہ کی ملکہ کی طرح تکریمی نوعیت کا ہے اور روزمرہ کے حکومتی معاملات میں شہنشاہ کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، مگر یہ عہدہ نمائشی ہرگز نہیں ہے۔ یہاں کوئی بھی شخص بادشاہ سے نظر ملا کر بات کرنے کی جسارت کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ برطانیہ میں تو پریس ملکہ برطانیہ پر تنقید بھی کرتا رہتا ہے مگر یہاں تو تاریخی طور پر بادشاہ کو خدا کا اوتار اور نائب تصور کیا جاتا تھا۔

صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے چار روزہ دورے کے دوران بنیادی طور پر تین موضوعات زیادہ زیر بحث رہے۔ دفاعی اور تجارتی امور کے علاوہ شمالی کوریا گفتگو کا بنیادی نقطہ رہا۔ حیرت انگیز طور پر ایران بھی دونوں ملکوں کے سربراہوں کی ملاقات میں گفتگو کا موضوع بنا رہا۔ جاپانی وزیر اعظم شنزو آبے کے ساتھ مشترکہ پریس کانفرنس کے دوران صدر ٹرمپ کا کہنا تھا کہ چونکہ ایران اور جاپان کے باہمی تعلقات بہت اچھے ہیں اور اگر جاپان ایران کے ساتھ امن کے لئے بات چیت کرے تو میں بھی بات کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جنگ کے امکانات کے تناظر

میں صدر ٹرمپ کا کہنا تھا کہ کوئی بھی ہولناک چیزیں نہیں دیکھنا چاہتا ہے، خاص طور پر بذات خود میں۔ خیر یہ سن کر میرے لئے اپنی ہنسی کو قابو رکھنا کافی مشکل تھا۔ قارئین کے لئے یہ خبر دلچسپ ہوگی کہ جاپانی وزیراعظم شائد وہ سربراہ مملکت ہیں جن کے ساتھ ٹرمپ کا سب سے زیادہ رابطہ رہتا ہے۔ امریکی صدر اور جاپانی وزیراعظم اب تک چالیس مرتبہ ٹیلی فون پر یا بالمشافہ ملاقات کر چکے ہیں۔ اس حیرت انگیز قربت کا انکشاف وائیٹ ہاؤس کے ترجمان نے خود ایک سوال کے جواب میں کیا ہے۔

وزیراعظم شنز وآبے کے تقریر نویس پروفیسر تو موہیکو کا یہ انکشاف دلچسپ ہے کہ جاپانی وزیراعظم وہ واحد غیر ملکی سربراہ ہیں جن سے صدر ٹرمپ گھنٹوں بے تکان گفتگو کر سکتے ہیں۔ امریکی صدر بغیر کسی تحریری موضوعات کی فہرست کے طویل گپ شپ کرتے ہیں، جس کی جاپان کے لئے بہر حال ایک تز ویراتی اہمیت ہے۔ دونوں ممالک کے سرکاری ترجمانوں کے بیانات اور تاثرات اپنی جگہ مقدم ہیں، مگر ریاستوں کے آپس میں تعلقات ویسے قطعاً نہیں ہوتے جیسے افراد کے باہمی تعلقات ہوتے ہیں۔ کسی ملک کی دوسرے ملک کے ساتھ دوستی اور دشمنی بے سبب اور مستقل نوعیت کی نہیں ہوتی۔ خارجہ تعلقات میں آج کی دنیا جس چیز کو سب سے زیادہ مقدم رکھتی ہے وہ ہر ملک کا اپنا قومی مفاد ہے۔ کبھی کوئی دیس اپنا نقصان کر کے کسی دوسرے دیس کا فائدہ نہیں کرتا ہے۔ باہمی مفادات ملکوں کو جوڑنے کا سبب بنتے ہیں۔ جہاں تجارتی مفادات کا ٹکراؤ آ جائے ،سب کو اپنی اپنی پڑ جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال موجودہ دورے کے دوران دونوں ممالک کا کسی حتمی تجارتی معاہدے پر نہ پہنچنا ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ اس کی زرعی اجناس پر عائد ڈیوٹی کم یا ختم کی جائے جبکہ گاڑیوں پر ڈیوٹی کم کرانے سمیت جاپان کا کہنا ہے کہ صرف زرعی اجناس کی بجائے نو ہزار اشیاء تجارت، جو کہ امریکہ اور جاپان کے درمیان باہمی بیوپار کی اشیاء ہیں، ان سب پر ایک جامع تجارتی معاہدہ کیا جائے۔ چار روزہ دورے کے دوران ایسا معاہدہ طے نہیں پا سکا، اب اگست میں شائد یہ معاہدہ طے پا جائے۔

صدر ٹرمپ کی جاپان میں مصروفیات کافی رنگا رنگ قسم کی رہیں۔ جاپان کے روایتی کھیل سوموکے چیمپئن شپ فائنل کے فاتح پہلوان کو صدر ٹرمپ کے ہاتھوں سے انعام دلوایا گیا۔ اتوار

کے دن کشتی کے اکھاڑے کے اردگرد امریکی صدر اپنی اہلیہ سمیت براجمان تھے اور جاپانی وزیراعظم بھی اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ ان کے پہلو میں بیٹھے تھے۔اس سے گزشتہ روز امریکی صدر اور شنزو آبے نے دن کا زیادہ تر حصہ ٹوکیو میں اکٹھے گالف کھیلتے ہوئے گزارا۔مبصرین کے نزدیک اس غیر روایتی ملاقات کا مقصد اگلے ماہ اوساکا میں ہونے والے G20 (جی ٹونٹی) اجلاس میں امریکی صدر کی شمولیت کو یقینی بنانا بھی تھا۔علاوہ ازیں فرانس میں ہونے والے گروپ سیون کے اجلاس میں شرکت پر ٹرمپ کو آمادہ کرنا بھی شامل تھا۔

دفاعی امور ہمیشہ جاپان اور امریکہ تعلقات کا اہم ترین موضوع ہوتا ہے۔امریکی صدر اور جاپانی وزیراعظم نے بحری اڈے پر فوجیوں سے خطاب کیا اور اس دورے کی مذکورہ جہت کی اہمیت کو بھی نمایاں کیا۔یاد رہے کہ جاپان میں پچاس ہزار امریکی فوجی مستقل طور پر تعینات رہے ہیں۔شمالی کوریا اور جاپان کے تعلقات تقریباً ویسے ہیں جیسے ہمارے بھارت کے ساتھ ہیں۔جب سے ٹرمپ صدر بنے ہیں وہ شمالی کوریا کے صدر سے دو مرتبہ مل چکے ہیں۔غالباً اسی تناظر میں وہ اپنی پریس کانفرنس کے دوران یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ مجھ سے پہلے آئے دن شمالی کوریا نئے میزائل اور نیوکلیئر ٹیسٹ کر رہا تھا مگر میرے آنے کے بعد یہ سلسلہ تھم گیا ہے۔حالانکہ گزشتہ ماہ ہی شمالی کوریا نے نئے میزائل کا تجربہ کیا ہے جو کہ امریکی صدر کے دعوے کی نفی کرتا ہے مگر اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔میرے لئے سب سے حیرت انگیز منظر وہ تھا جب صدر ٹرمپ کا قافلہ ٹوکیو کی سڑکوں سے گزر رہا تھا اور سکول کے بچے گرم جوشی سے امریکی اور جاپانی پرچم لہرا کر اس کا استقبال کر رہے تھے،جنگ عظیم دوم کے دوران جتنا جانی اور مالی نقصان امریکہ کے ہاتھوں جاپان نے اٹھایا شائد انسانی تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے ہی

ملے ،مگر دورِ حاضر کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قومی مفاد میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب امریکہ سے دوستی کر لی جائے۔ مقامی لوگوں سے ملاقات اور گفتگو کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ دلی طور پر امریکہ کو پسند کرتے ہیں۔ کبھی ہیروشیما اور ناگاسا کی کی بات کریں تو عموماً لوگوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تباہی جنگ کے نتیجے میں آئی تھی ،اس لئے جنگ سے نفرت کرنی چاہیئے ،امن کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ امریکہ نے بلا شبہ زیادتی کی تھی مگر قصور جاپان کا بھی تھا۔ محسوس ہوتا ہے جنگ کی یادداشتیں پسِ پشت ڈال کر امریکہ اور جاپان ایک طویل خوشگوار تجارتی اور سفارتی تعلق چاہتے ہیں۔

جاپان روس سرحدی تنازعہ

جاپان جزائر کا ایک جھرمٹ ہے، جس کی زمینی سرحد کسی دوسرے ملک کے ساتھ نہیں ملتی ہے۔ گزشتہ ہفتے روسی صدر ولادی میر پیوتن اور جاپانی وزیراعظم شنزو آبے کی روس کے مشرق بعید میں واقع شہر ولادی واستوک میں ملاقات ہوئی۔ دیگر امور کے علاوہ اس ملاقات کا بنیادی موضوع دوسری جنگ عظیم کے دوران روس کے زیر قبضہ چلے جانے والے جاپانی جزائر اوران کی ممکنہ واپسی تھا، ان جزائر کی تعداد چار ہے۔ جاپانی میڈیا کے مطابق یہ ملاقات بے نتیجہ رہی، کہیں کہیں ناکام بھی کہا جا رہا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم جسے جدید دنیا کہتے ہیں وہ کئی حوالے سے وہی عالم کہنہ ہے، ہزاروں سال کے ارتقاء کے باوجود طاقت کی بالادستی کا آئین کچھ زیادہ تبدیل ہوتا نظر نہیں آتا ہے۔ آج بھی تین ہزار سال پہلے چندر گپت موریا کے قانون ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اصول پر ہماری دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ اب اقوام متحدہ سے معتبر ادارہ کون سا ہوگا؟ اس ادارے کے پانچ مستقل ممبرز جن کے پاس ویٹو پاور ہے، وہ کون ہیں؟ یقیناً یہ دوسری جنگ عظیم کے فاتح ممالک ہیں۔ انہی ممالک نے نئی دنیا اور اس کے اصول وضوابط طے کئے ہیں۔ اگر یہ پانچ ممالک دن کو رات کہہ دیں تو باقی 195 ممالک کو ماننا پڑے گا کہ یہ رات ہے اور اگر سفید دن کو ان میں سے کوئی ایک بھی ویٹو پاور کا حامل ملک کہہ دے کہ وہ ایسا نہیں مانتا تو تمام دنیا کو اس کی ضد کے آگے ہار ماننا پڑے گی۔

ایسٹرن اکنامک فورم کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے جاپانی وزیراعظم روس پہنچے تو ان

کی صدر پیوتن سے یہ 27ویں ملاقات تھی، جس کا ایجنڈا جاپانی جزائر کی ممکنہ واپسی تھی، دوسری جنگ عظیم جب خاتمے کے قریب تھی تو موقع غنیمت جانتے ہوئے روس نے جاپان کے ان چار جزائر پر قبضہ جمالیا۔صدر یلسن کے دور میں روس اور جاپان تصفیے کے قریب تھے۔صدر بورس یلسن جدید روس کے پہلے صدر اور انتہائی کمزور حکمران تھے، آپ یلسن کو روس کا یحییٰ خان کہہ سکتے ہیں۔کچھ لے دے کر وہ چار میں سے تین جزیرے دینے پر رضا مند ہو گیا تھا، مگر اس وقت امریکہ نے کھنڈت ڈال دی، روس اور جاپان کے باہمی اچھے تعلقات اس کے لئے براشگون ہیں، دونوں ممالک کے امن معاہدے کی صورت میں امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ اوکھی ناوا کے جزیرے کو اپنا حصہ قرار دے دے گا، یادر ہے کہ اس وقت بھی جاپان کے جزیرے اوکھی ناوا میں چھبیس ہزار امریکی فوجی تعینات ہیں، جاپان کی دوسری جنگِ عظیم میں شکست کے بعد یہاں سب سے بڑا امریکی اڈا رہا ہے۔ ولادی میر پیوتن کے برسر اقتدار آنے کے بعد تو گویا دنیا ہی بدل گئی۔شروع میں تو اس نے صاف انکار کر دیا کوئی جزیرہ واپس نہیں ہوسکتا۔ بعدازاں 1956 کے سوویت جاپان معاہدے کی روشنی میں بات چیت کے آغاز پر آمادہ ہوا، جس میں دو جزائر کی واپسی پر سوویت یونین راضی تھا۔

روس اور جاپان کی مخاصمت کا ایک خوبصورت تاریخی پہلو جاپان میں اسلام کی آمد اور پہلی مسجد کی تعمیر ہے۔زار کی حکومت کے دوران 1905 اور پھر 1915 میں روس کی جاپان کے ساتھ جنگ ہوئی۔1905 کی جنگ میں تیس ہزار کے قریب روسی فوجی جنگی قیدی بنا لئے گئے۔ان میں عیسائیوں اور یہودیوں کے علاوہ ایک ہزار مسلمان فوجی بھی تھے۔اوسا کا شہر کے قریب ان قیدیوں نے دوران اسیری مسجد کی تعمیر بھی کی تھی، ہوسکتا ہے ان سے تعمیر زبردستی کروائی گئی ہو۔اس کا ثبوت جاپانی شہنشاہ کا زار شاہی کو لکھا گیا وہ خط بھی ہے جس میں قیدیوں سے حُسنِ سلوک کا تذکرہ کرتے ہوئے شہنشاہ جاپان نے لکھا تھا کہ عیسائی، یہودی اور اسلام کے پیروکاروں کے لئے چرچ، سینیگاگ اور مسجد تعمیر کروائی گئی ہے جس میں وہ آزادانہ عبادت کرتے ہیں۔اس کے علاوہ روس کی نیم خودمختار ریاست تاتارستان کے سابق گورنر یاشن سانخ نے جاپان کی اس پہلی

مسجد کے حوالے سے ایک مضمون لکھا ہے ،اس مضمون میں اس مسجد کی تمام تفصیلات درج ہیں۔بدقسمتی سے یہ مسجداب معدوم ہوچکی ہے مگر مسلمان قیدیوں کی قبروں پر لگے کتبے اور قرآنی آیات اب بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔قبور کے قریب ایک یادگار مینار بھی تعمیر کیا گیا ہے جس پر بائیبل اورتورات کے علاوہ قرآن کریم کی آیات مبارکہ بھی کنداں ہیں۔یادرہے کہ جاپان کی روس پر فتح پانے کے موقع پر علامہ اقبال نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں جاپان کو ایشیاء کا ابھرتا ستارہ کہا گیا تھا اور ملت اسلامیہ کے لئے قابل تقلید تحریر کیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور جاپان کا امن معاہدہ تو ہوگیا مگر روس اور جاپان قانونی طور پر ابھی تک حالت جنگ میں ہیں۔گرچہ شنزوآبے جاپان کی تاریخ کا سب سے طویل عرصہ حکمران رہنے والے وزیراعظم ہیں اور پیوتن گزشتہ بیس برس سے اقتدار میں ہیں،دونوں کی باہمی کیمسٹری بھی بہترین ہے،مگر مجھے یہ معاملہ حل ہوتا نظر نہیں آرہا۔اس کی وجہ ولادی میر پیوتن کا فوجی پس منظر ہے،اس کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ وہ ایک انچ بھی شائد جاپان کو نہیں دے گا۔ایک طرف تو روس بات چیت کررہا ہے دوسری طرف وہ ان جزائر میں اپنا عسکری اثر ورسوخ بڑھارہا ہے،عملی طور پر وہ اپنا قبضہ مزید پختہ کرنے کے اقدامات کررہا ہے۔جاپانی وزیراعظم نے مشترکہ ترقیاتی منصوبوں کا خیال پیش کیا تھا،مگر اس بابت روس کی شرائط ایسی ہیں جنہیں پورا کرنا مشکل ہے۔جاپان کے لئے ان جزائر کی اہمیت کوئی عسکری یا معاشی مفاد تک محدود نہیں ہے۔کل 6853 جزائر پر مشتمل یہ دیس ہے،جن میں چار جزائر کے جمع یا منفی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ مسئلہ قومی حمیت کا ہے۔

حلال نیل پالش

خواتین کے لئے خوشخبری ہے کہ اب حلال نیل پالش بھی دستیاب ہے۔جاپان میں بننے والی اس نیل پالش کولگا کر وہ بار بار وضو کرسکتی ہیں۔اس کی تیاری میں شامل ہونے والے تمام اجزاء حلال ہونے کے علاوہ پانی اس میں سے گزر کر ناخن کو چھوسکتا ہے۔اس ایجاد کا سہرا جس جاپانی خاتون کے سر سجتا ہے،اس کی کہانی سننے سے تعلق رکھتی ہے۔حال ہی میں منصۂ شہود پر آنے والی اس نیل پالش کی خوبی یہ ہے کہ یہ طویل المدتی اثرات رکھتی ہے۔یعنی ایک ہفتے تک ناخنوں پر اپنے رنگوں کا رچاؤ،خوبصورتی اور جاذبیت برقرار رکھتی ہے۔ہوسکتا ہے بعض لوگ سوچتے ہوں کہ ایسی مصنوعات تو ایک عرصے سے بازار میں دستیاب ہیں؟اس میں خبریت کی کونسی بات ہے؟خود ہمارے خاندان میں مذہبی رجحان رکھنے والی لڑکیاں مہندی کے عرق کو بطور نیل پالش استعمال کرتی ہیں۔

عرض یہ ہے کہ ٹوکیو میں قائم حلال نیل نامی کمپنی کی روح رواں بیتومی گوتو کی مذکورہ ایجاد سے پہلے بازار میں جتنی بھی اقسام کی حلال نیل پالش دستیاب تھیں،وہ سب ناخنوں پر چند گھنٹوں کی مہمان ہوتی تھیں۔گرچہ کینیڈا اور ملائشیاء کی بعض کمپنیاں اپنی حلال نیل پالش عالمی سطح پر فروخت کرتی آئی ہیں مگران سب میں یہ مشترکہ مسئلہ تھا،یعنی کوئی بھی ناخن پر اگلے دن تو کیا،اگلے پہر تک بھی جاذبیت برقرار نہ رکھ پاتی تھیں۔بعض قارئین کی شائداس بات میں دلچسپی ہوکہ بھلا عام نیل پالش اور حلال نیل پالش میں کیا فرق ہے؟بات بہت بنیادی اور سادہ ہے۔عام

نیل پالش لگانے کے بعد پانی ناخن کو چھو نہیں سکتا، جب ناخن کو پانی نہیں چھوئے گا تو پھر وضو نہیں ہوگا۔اور جب وضو نہیں ہوگا تو پھر نماز بھی ادا نہیں ہوگی۔

معروف عالم دین جاوید احمد غامدی کی رائے اس بارے میں ذرا مختلف ہے۔ان سے پچھلے دنوں جب وہ امریکہ گئے تو وہاں خواتین نے سوال کیا، کہ کیا نیل پالش لگا کر وضو ہو جاتا ہے؟اور اس طرح وضو سے نماز قبول ہو جاتی ہے؟ غامدی صاحب نے فرمایا کہ اگر وضو کرنے کے بعد نیل پالش لگائی جائے تو پھر دوبارہ وضو کرنے کے لئے نیل پالش اتارنا ضروری نہیں۔ بلکہ اسی طرح اگلا وضو اور اگلی نماز جائز ہے۔غامدی صاحب جیسے بڑے عالم دین سے اختلاف کرنا آسان بات نہیں،مگر میرے نزدیک انہوں نے اس بابت غالباً یہی پہلو مدّ نظر رکھا کہ ناخن کو پانی چھونا چاہیئے،ان کی تجویز اس بات سے ملتی جلتی ہے کہ جیسے موزہ پہن لیں تو پھر ہر بار وضو کے دوران پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں ۔نیل پالش کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں شائد انہوں نے غور نہیں کیا۔الکحل ہر عام نیل پالش کا لازمی جزو ہے۔

عمومی طور پر مسلمانوں کا حلال اور حرام کا تصور کھانے، پینے کی اشیاء تک ہی محدود ہوتا ہے۔میرے لئے مگر چشم کشاء واقعہ تھا، جب لیدر جیکٹ خریدتے وقت میرے دوست نے لاطینی امریکہ کے اس شاپنگ مال کے سیلز مین سے پوچھا کہ یہ کس چمڑے کی بنی ہے؟ میرے استفسار پر کہ بھلا یہ کیا سوال کر دیا آپ نے،نوجوان سیلز مین تو انکوائری میں پڑ گیا؟ بزرگ دوست نے مجھے سمجھایا کہ یہاں خنزیر کے چمڑے سے بنی جیکٹس عام بکتی ہیں،اس لئے پوچھ رہا ہوں۔میں نے گزارش کی کہ قرآن کریم میں تو ''لحم خنزیر''یعنی سور کے گوشت کے حرام ہونے کا ذکر آیا ہے، یہ جوتے، جیکٹ جو کہ کھال سے بنتے ہیں، یہ کیسے حرام ہوئے؟ میرے بزرگ دوست کا استدلال بھی بجا تھا کہ سور کے چمڑے کی جیکٹ پہن کر آپ نماز تو نہیں پڑھ سکتے نا؟ بلا شبہ تقویٰ یہی ہے ۔نیل پالش کی بابت بھی یہی بات صادق آتی ہے کہ حرام اجزاء سے بنی چیز جسم پر سجا کر نماز پڑھنا تو شائد غامدی صاحب کے نزدیک بھی جائز نہیں ہو سکتا ہے۔

بدھ مت کی پیروکار ایک خاتون کا حلال نیل پالش ایجاد کرنے کا قصہ دل کو چھو لینے والا ہے۔ہیتومی گوتو آجکل رضا کارانہ طور پر ٹوکیو اسپتال میں کینسر کے موذی مرض میں مبتلا خواتین

کو سنگھارتی ہیں، ان کے ناخن صاف کر کے ان پر نیل پالش لگاتی ہیں، تاکہ کیموتھراپی کی وجہ سے ناخن بدنما اور بدرنگ دکھائی نہ دیں۔ اس کہانی کی ابتداء اس کی والدہ کی کینسر میں مبتلا ہونے اور پھر 2010 میں وفات پا جانے سے ہوئی۔ اس رحمدل خاتون کا اصل امتحان ابھی باقی تھا۔ دو سال بعد وہ خود چھاتی کے کینسر میں مبتلا ہوگئی۔ خدا کے فضل سے وہ صحت مند تو ہوگئی مگر اس مرض نے اس کو بہت سارے سبق سکھائے۔ اس نے ''کینسر نیل آرٹسٹ'' بننے کا فیصلہ کیا۔ یہ بات سننے میں عجیب لگتی ہے مگر اس مرض میں مبتلا افراد اور ان کے عزیز و اقارب اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ جب کینسر کے مریض کی کیموتھراپی ہوتی ہے تو وہ بہت پست حوصلہ ہو جاتے ہے، بڑے بڑے حوصلہ مند افراد ایک اسٹیج پر ہمت ہار دیتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ذاتی نگہداشت بہت ضروری ہے۔ چونکہ کیموتھراپی کے سائیڈ افیکٹ کے دوران دماغی صحت بھی ایک مسئلہ ہے۔ اس لئے مریض خواتین میں زندگی کی امنگ ابھارنے کے لیے گوتو کے بقول ہاتھ کے ناخنوں کی صفائی کر کے ان پر نیل پالش لگا دینا، مریض کی دنیا بدل دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ عمل جینے کی آرزو پیدا کرنے کا سبب سکتا ہے۔

کینسر کے مریض کیمیکل کے معاملے میں بڑے حساس ہو جاتے ہیں جب ان کی کیموتھراپی ہوتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہر نیل پالش میں کیمیکل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ مریض کو الرجی میں مبتلا کر دیتے ہیں، اور دیگر اعتبار سے بھی یہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس نیل پالش کو اتارنا بھی بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے، جو کہ کینسر کے مریضوں کے لئے

تکلیف دہ عمل ہے۔اس نوجوان کینسر نیل آرٹسٹ خاتون نے بتایا کہ الکحل کے بغیر وارنش ڈھونڈنا آسان کام نہ تھا۔اس کی یہ جستجو اور تلاش اسے حلال نیل پالش کی دریافت تک لے آئی۔دستیاب حلال نیل پالش کینسر کے مریضوں کے لئے بہتر تھی مگر یہ جلد ہی اتر جاتی تھی۔حلال نیل پالش کو دیر پا بنانے کے لئے ٹوکیو اسپتال میں ہی اس جاپانی خاتون کو وہ وارنش مل گیا۔جس سے دیر پا اثر رکھنے والی یہ نئی حلال نیل پالش ایجاد ہوئی۔اس کا محرک گرچہ مریض خواتین کی ذہنی صحت کو بہتر بنانا تھا۔مگر گوتو کا اپنا بیوٹی پارلر بھی خوب چل گیا ہے اور مسلمان خواتین اس کی گاہک ہیں۔اس کی ایجاد کردہ حلال نیل پالش اب پوری دنیا میں فروخت ہو رہی ہے۔

تاج پوشی

شہنشاہ کو جاپان میں روحانی و مذہبی تکریم حاصل ہے۔اسے عوام دنیاوی حکمرانوں کی طرح تصور نہیں کرتے ہیں۔بادشاہ کے لئے روایتی طور پر یہاں جو لفظ رائج ہے،اس کا ترجمہ ''بھگوان کا اوتار'' خدا کا نمائندہ وخلیفہ یا پھر لفظ ''تھن نو'' کا مفہوم خدا کی کرسی پر بیٹھا اس پروردگار کا پرتو شخص ہے۔دوسال پہلے شہنشاہ اکیؔ ہیتو نے تخت سے دستبرداری کا اعلان کر کے اہلِ جاپان اور دیگر عالم کو ورطہء حیرت میں ڈال دیا تھا۔اس تحیر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پچھلے دوسو سال میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ جیتے جی تاج وتخت تیاگ دے۔شاہی فرمان میں اقتدار سے علیحدگی کا سبب صحت کے مسائل بیان کئے گئے تھے۔بہر حال حکم شاہی بجالایا گیا۔گزشتہ دو برس ولی عہد سلطنت شہزادہ ناروہیتو کی تخت نشینی کے انتظامات کرنے میں صرف کئے گئے۔گزشتہ ہفتے نئے شہنشاہ کی رسم تاج پوشی کا انعقاد کیا گیا۔دنیا کے 180 ممالک کے سربراہان مملکت یا ان کے خصوصی نمائندگان نے شرکت کی۔پاکستان کے صدر عارف علوی بھی اس تاج پوشی کی تقریب میں شریک ہونے کے لئے خصوصی طور پر چار روزہ سرکاری دورے جاپان تشریف لائے۔

صدر عارف علوی سمیت 180 ممالک کے سربراہان یا خصوصی نمائندگان کے لئے ایک خصوصی ہال تیار کروایا گیا تھا، جہاں ان مہمانوں نے براہ راست یہ تقریب سکرین پر دیکھی اور شاہی محل میں موجود ہونے کے باوجود تقریب کے کمرے میں جانے کی فقط چند لوگوں کو ہی اجازت تھی۔سادہ سی تقریب میں نئے بادشاہ نے عنان اقتدار سنبھالنے کا رسمی اعلان کیا۔اس کے

بعد وہاں موجود وزیراعظم نے سب سے پہلے بادشاہ کو تخت سنبھالنے پر مبارکباد کا پیغام پڑھ کر سنایا۔اور پھر مہمانوں نے ''زندہ بادشہنشاہ'' کا نعرہ بلند کیا۔ نئے تاجدار کی درازی عمر کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔جاپانیوں کی اکثریت کا یہ مذہبی نظریہ ہے کہ بادشاہ سورج کی دیوی ''سوریاماتا'' کی نسل سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔یاد رہے کہ موجودہ شاہی خاندان گزشتہ ڈھائی ہزار سال سے زائد عرصے سے حکمران چلا آ رہا ہے۔یہ سن 600 قبل مسیح کا واقعہ ہے، جب اس خاندان کا پہلا شخص تخت نشین ہوا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اتنے عرصے بعد بھی لوگ شاہی سلسلے سے اکتائے نہیں ہیں۔جاپان میں کیمونسٹ پارٹی کے ارکان ہوسکتا ہے کہ شہنشاہ کو خدا کا اوتار نہ مانتے ہوں مگر تخت گرانے اور تاج اچھالنے کا نعرہ وہ بھی نہیں لگاتے۔برطانیہ میں شاہی خاندان سے اختیارات تو ایک طویل جدوجہد کے بعد آہستہ آہستہ پارلیمان نے حاصل کئے ہیں، جس کا آغاز بارہویں صدی میں ''میگنا کارٹا'' سے ہوتا ہے، مگر جاپان میں ایسا نہیں ہوا۔دوسری جنگ عظیم کی شکست کے بعد بادشاہ نے ریڈیو پر قوم سے خطاب میں کہا کہ ''آج سے وہ ایک عام انسان ہیں۔خدا کا اوتار نہیں ہیں''اس مختصر اعلان کے بعد شاہی اختیارات پارلیمنٹ کو منتقل کردیئے گئے۔اس عمل میں امریکی دباؤ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔

جاپان کا کیلنڈر نئے بادشاہ کی تاج پوشی کے ساتھ ہی تبدیل ہوجاتا ہے۔ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ہر عہد کا ایک نام ہوتا ہے۔جیسے سن عیسوی گزشتہ دو ہزار سال سے جاری ہے اور ہجری کیلنڈر سرکار دو عالمؐ کی مکہ سے مدینہ ہجرت کے ڈیڑھ ہزار سال بعد آگے بڑھ رہا ہے، جاپان میں نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے ساتھ ہی سال اور عہد یکا یک بدل جاتے ہیں۔اس نئے عہد کا نام ''ریوا'' رکھا گیا ہے۔مہینہ اور دن کی تاریخ تو یہاں بھی دیگر عالم جیسی ہے مگر سال یہاں ''ریوا 1''ہوگیا۔اس سے پہلے 32 سال ''ہیسے'' عہد رہا۔اور 58 سال تک ''شووا'' جو کہ شہنشاہ ہیرو ہیتو کا دور تھا۔

نارو ہیتو نے تخت تو مئی میں ہی سنبھال لیا تھا اور نئے عہد، کیلنڈر کا آغاز بھی اس سال مئی سے ہوگیا ہے، مگر تاج پوشی کی باقاعدہ رسم چھ ماہ بعد منعقد ہوئی ہے۔گزشتہ مرتبہ تو تخت نشینی کی تقریب اکی ہیتو کے تاج و تخت سنبھالنے کے دو سال بعد انعقاد پذیر ہوئی تھی۔سابق شہنشاہ اکی

ہیتو کئی اعتبار سے بڑے جدت پسند اور غیر روایتی شخص ہیں۔دو صدیوں میں پہلی مرتبہ مرنے سے پہلے اقتدار کو خیر باد کہنے کے علاوہ انہوں نے یہ بھی غیر روایتی اور غیر متوقع وصیت کر دی ہے کہ انہیں زمین میں دفن کرنے کی بجائے عام لوگوں کی طرح مرنے کے بعد جلا دیا جائے۔ بدھ مت اور شنتو مذہب میں ہندوؤں کی طرح مردے کو جلایا جاتا ہے مگر بادشاہ کو مرنے کے بعد زمین میں دفن کیا جاتا ہے۔جیسا کہ ہندوؤں میں رواج ہے کہ مہاتما،مہا پرش اور کوئی مہان شخص مر جائے تو اسے زمین میں گاڑھ دیتے ہیں،ویسے تو ہندو مت میں بچوں کو بھی مرنے پر جلایا نہیں جاتا بلکہ ان کی تدفین کی جاتی ہے۔

پچھلے دنوں سمندری طوفان سے ہونے والی سو کے قریب ہلاکتوں کے پیش نظر نئے شہنشاہ کے اعزاز میں ہونے والی مسلح افواج کی پریڈ ایک ماہ کے لئے موخر کر دی گئی ہے۔پچھلے ساٹھ سال میں اتنا شدید سمندری طوفان جاپان میں کبھی نہیں آیا جیسا شدید ٹائیفون یہ تھا کہتے ہیں کہ 1958 میں اتنی شدت کا سمندری طوفان آیا تھا۔جس سے اس طوفان کی نسبت دس گنا زیادہ ہلاکتیں ہوئی تھیں۔اس بار پیشگی اطلاعات کے نظام اور احتیاطی تدابیر کی وجہ سے جانی نقصان کم ہوا ہے۔رسم تاج پوشی اس ٹائیفون کی پھیلائی تباہی کی وجہ سے ملتوی اس لئے نہیں کی گئی چونکہ پوری دنیا سے سربراہان مملکت مدعو تھے اور ظاہر ہے سب کی اپنی اپنی مصروفیت ہوتی ہے،جس میں سے وقت نکال کر انہوں نے بیرونی دورے کرنے ہوتے ہیں۔تخت نشین ہونے کے بعد نئے بادشاہ نے ساڑھے پانچ لاکھ قیدیوں کی سزا معاف کر کے ان کی فوری رہائی کا حکم دیا ہے۔ہمارے ہاں کا منظر تو بقول شاعر یہ ہے کہ

تم سے پہلے جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اپنے خدا ہونے کا اسے اتنا ہی یقیں تھا

جاپان کا معاملہ مگر الٹا ہے،یہاں بادشاہ اعلان کرتا ہے کہ وہ ایک عام انسان ہے مگر عوام میں اسے خدا ماننے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔تاج پوشی کی اس تقریب کے انعقاد اور اس رسم سے متعلق انتظامات پر 23 ارب روپے خرچ کئے گئے۔

اک نئے عہد کا آغاز

جدید ریلوے نظام دنیا بھر میں جاپان کی امتیازی پہچان رہی ہے۔ یہاں چلنے والی بلٹ ٹرین رفتار کے اعتبار سے آج بھی پورے عالم میں سب سے زیادہ سرعت رفتار ریل گاڑی ہے۔ جب ہم سنتے ہیں کہ یہاں کا ریل سے متعلق نظام سب سے بہتر اور جدید ترین ہے تو اس سے مراد فقط تیز رفتار گاڑیاں ہی نہیں ہوتی ہیں، بلکہ اس بابت اور بھی بہت کچھ ہے جو قابل ذکر ہے۔اوسا کا میٹرو کمپنی جو کہ زیر زمین ریل گاڑیاں چلاتی ہے، گزشتہ دنوں اس نے ٹیکنالوجی کے اک نئے عہد سے روشناس کرایا ہے۔ایک ایسے دور میں قدم رکھا ہے جس کے آنے والے دنوں میں پوری دنیا پر بہت گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔ کہنے کو تو یہ ایک فقط نیا سنگ میل ہے کہ ٹکٹ چیکر کی جگہ جیسے پلیٹ فارم پر داخلے کے لئے آٹومیٹک گیٹ لگادیئے گئے تھے، جن میں آپ ایک سوراخ سے ٹکٹ ڈالتے ہیں اور دوسرے سوراخ سے تصدیق شدہ ٹکٹ نکال لیتے ہیں، جو کہ برقی طریقے سے تصدیق شدہ ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل جاتا ہے اور آپ پلیٹ فارم کی جانب جا سکتے ہیں۔ یہی عمل پلیٹ فارم سے نکلتے وقت دہرایا جاتا ہے، ٹکٹ برقی گیٹ میں بنے ایک سوراخ سے ڈالی جاتی ہے اور دوسرے سے نکال لی جاتی ہے، اور دروازہ کھل جاتا ہے۔ اگر ٹکٹ میں کوئی خرابی ہو یا پھر مطلوبہ نرخ سے کم قیمت کا ٹکٹ ڈالیں تو دروازہ نہ صرف کھلنے سے انکار کر دیتا ہے بلکہ سائرن اور گھنٹیاں بھی بجنے لگتی ہیں۔

اگلے مرحلے پر یہ ہوا کہ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر داخلے اور اخراج کے لئے نصب

گیٹ کمپیوٹر سے منسلک کر دیئے گئے۔اب ان دروازوں میں ٹکٹ ڈالنے اور نکالنے کی زحمت سے بچنے کی ترکیب آ گئی ۔مسافروں کو(I.C) آئی سی کارڈ جاری کر دیئے گئے۔یہ آئی سی کارڈ آپ برقی گیٹ پر رکھیں تو وہ ''کھل جا سم سم'' کے مصداق چوپٹ کھل جاتا ہے۔شرط یہ ہے کہ آپ نے آئی سی کارڈ میں رقم جمع کروا رکھی ہو۔جیسے موبائل میں ایزی لوڈ کروایا جاتا ہے، ویسے ہی یہ کارڈ کہیں سے بھی ری چارج کروایا جا سکتا ہے۔آپ اسے کریڈٹ کارڈ کی ہی ایک قسم کہہ سکتے ہیں، جو کہ جگہ جگہ بازاروں اور دوکانوں میں خریداری کے لئے استعمال ہو جاتا ہے۔

نئی ایجاد مگر ہوش ربا ہے۔یوں تو بہت سادہ سا عمل ہے کہ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر داخلے اور خروج کے لئے جو برقی گیٹ لگے ہیں ان کی جگہ جدید ترین برقی دروازوں کا تجربہ کیا گیا ہے۔نئے برقی گیٹ پر لگے کیمرے آپ کے چہرے کی شناخت کریں گے، اپنے کمپیوٹر میں موجود آپ کی معلومات کی تصدیق کریں گے اور پھر خود بخود دروازہ کھل جائے گا۔مسافر کو ٹکٹ دکھانے کے لئے رکنے کی گزشتہ صدی کی روایت دم توڑ دے گی۔اور وہ سیدھے اس دروازے سے ایسے ہی گزر جائیں گے جیسے آپ سیکیورٹی گیٹ سے گزر جاتے ہیں۔گماں یہ ہے کہ روز سفر کرنے والے حضرات کا چہرہ دیکھ کر ٹکٹ کی رقم ان کے بل میں جمع ہو جائے گی اور ماہانہ دیگر اشیاء صرف جیسے بجلی ، پانی، گیس اور ٹیلی فون کے بلوں کی طرح ریل کا بل بھی آپ کے گھر آ جایا کرے گا۔گزشتہ روز سینکڑوں افراد کی موجودگی میں اس نئی دریافت کا اوساکا کے ایک زیر زمین ریلوے اسٹیشن پر افتتاح کیا گیا۔میڈیا کے کیمروں کی ایک بہت بڑی تعداد اس ''باب چہرہ شناسائی'' یا روشناسی کے دروازے میں سے ریلوے کے ان افراد کی آزمائشی آمد و رفت دیکھ رہی تھی جن کا ڈیٹا اس برقی گیٹ کے کمپیوٹر میں ڈالا گیا تھا۔

اب یہ ہوگا کہ جن مسافروں کے چہروں کا ریکارڈ اس برقی خودکار گیٹ کے اندر موجود ہوگا وہ تو با آسانی اس میں سے گزر کر اپنی ٹرین پکڑ لیں گے مگر انجان شکل کے مسافر نامراد لوٹیں گے۔ان برقی دروازوں سے منسلک چہرہ شناسی کے لئے نصب کیمرے اور کمپیوٹر یقیناً بہت اعلیٰ کوالٹی کے ہوں گے۔کیونکہ چند برس پہلے کچھ جاپانی مہمان ہمارے گھر میاں چنوں تشریف لائے تو میری بھتیجی فاطمہ کا ان کو ملنے کے بعد تاثر یہ تھا کہ تمام جاپانیوں

کے چہرے ایک جیسے ہوتے ہیں۔عورت،مرد،بوڑھے،جوان سب کے سب یک صورت لگتے ہیں،لہٰذا چہرہ شناسی کے لئے نصب ان دروازوں کوایجاد کرتے ہوئے یہ پہلو بھی مد نظر یقیناً رکھا گیا ہوگا۔

یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کہ یہ جدید ترین دروازے جو چہرہ شناسی کی بنیاد پر کھلتے اور بند ہوتے ہیں،کسی فرد واحد کی ایجاد نہیں ہیں۔چار جدید ٹیکنالوجی سے متعلق کمپنیاں اشتراک عمل کے نتیجے میں یہ جدید ترین ایجاد منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔اوسا کا زیر زمین ریلوے کی کمپنی نے اعلان کیا ہے کہ سن 2024 تک تمام داخلے اور اخراج کے دروازے، پلیٹ فارم پر ان نئے برقی چہرہ شناس دروازوں سے بدل دیئے جائیں گے۔2025 میں اوسا کا شہر میں منعقد ہونے والی ایکسپو کے مہمان ایک بدلا ہوا ریلوے نظام دیکھیں گے۔نجی ریل کمپنی کے ترجمان کا کہنا تھا کہ ہم نئی ٹیکنالوجی کے ذریعے ریلوے اسٹیشن کا ماحول بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ان جدید برقی دروازے بنانے کا ٹھیکہ اس کی موجد چاروں کمپنیوں کو الگ الگ دیا گیا ہے،اور وہ چار الگ الگ ریل اسٹیشن پر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کریں گی۔سب سے بہتر دروازے بنانے والی کمپنی کو بعد ازاں اوسا کا شہر اور پھر ہوسکتا ہے پورے ملک کے ریلوے اسٹیشنز پر اسی طرح کے چہرہ شناس برقی دروازے بنانے کا ٹھیکہ مل جائے۔یہ معمولی کمپنیاں نہیں ہیں،توشیبا،اومرون سوشل سلوشن،نیپون سگنل اور تھا کامی ساوا ٹیکنالوجی کے شعبے میں دنیا کی بہترین کمپنیاں مانی جاتی ہیں۔ان چاروں اداروں کو اگلے برس ستمبر تک اپنا اپنا ریلوے اسٹیشن کا منصوبہ مکمل کرنے کا وقت دیا گیا ہے۔ستمبر میں ریلوے کے 1200 افراد ان باب روشناسائی یا چہرہ شناسی میں سے گزر کر عملی طور پر منصوبے کا افتتاح کریں گے۔

آپ تصور کریں جب یہ ٹیکنالوجی ریلوے اسٹیشنوں کے بعد ہوائی اڈوں پر نصب کر دی جائے گی تو کون کون سی تبدیلیاں لے کر آئے گی؟ عین ممکن ہے کہ ان خودکار برقی دروازوں کی بدولت چہرے سے شناخت کا نظام اتنا ترقی کر جائے کہ پاسپورٹ کی ضرورت ہی ختم ہو جائے۔امیگریشن حکام تمام مسافروں کی معلومات وکوائف خودکار برقی دروازوں کے اندر نصب کمپیوٹر میں ڈال دیں اور لوگوں کے چہرے شناخت کرتے ہوئے گیٹ خود بخود کھلتے چلے

جائیں۔ یہ کوئی ایسی انہونی اور اچنبھے کی بات نہیں ہے ۔ٹوکیو کے عالمی ہوائی اڈے پر ایسے خودکار امیگریشن گیٹ پہلے سے نصب ہیں جو کہ آپ کا پاسپورٹ سکین اور دوبارہ داخلے کا ویزہ دیکھ کر خودبخود کھل جاتے ہیں۔ مشرقی یورپ کے کئی ممالک میں کاغذ سے آزاد امور حکومت چلانے کا تجربہ بڑی کامیابی سے جاری ہے۔

آنے والے دنوں کا منظر نامہ چشم تصور میں لائیں تو ہر دفتر اور مقام جہاں داخلے کیلئے شناختی عمل سے گزرنا پڑتا ہے، یہ چہرہ شناس گیٹ شکل دیکھ کر داخلے کی اجازت دے دے گا، یا پھر دھتکار دے گا۔ آدمی کا چہرہ ہی اس کا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ بن جائے گا۔ ہوسکتا ہے پاکستان میں یہ وقت آتے آتے کافی دیر لگ جائے ،مگر ٹیکنالوجی کو روکنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ تمام تر مسائل اور وسائل کی گفتگو اپنی جگہ مگر نیویارک اور کابل شہر میں آئی فون کا نیا ماڈل ایک ہی دن پہنچا ہے۔ لندن اور پیرس میں استعمال ہونے والے جدید ترین کمپیوٹرز کے ماڈل لاہور اور کراچی میں بھی اسی تعداد میں موجود ہیں۔

عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

بہار کے آخری دن ہیں۔گلوں کی رت میں پھولوں کو کھلنے سے بھلا کون روک سکتا ہے۔بہار کے موسم کی خوبصورتی شائد اسکے اختصار میں پنہاں ہے۔جاپان میں موسمِ گل کا نقطہ عروج چیری کے پھولوں کا کھل اٹھنا سمجھا جاتا ہے۔چیری کی شاخوں نے پھول تو اس بار بھی اٹھائے مگر ان پھولوں کی دید کے لئے جوق در جوق آنے والے احباب اس بار مفقود رہے۔کرونا وائرس کے عالمی سطح پر ڈھائے گئے مظالم کی فہرست بہت طویل ہے۔جس میں ایک یہ بھی کہ فصلِ بہار کے عین شباب پر چیری بلاسم دیکھنے کا تہوار اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت کسی دید کے بغیر ہی گزر گیا۔چیری کے پھولوں کی دید کا تہوار جسے مقامی زبان میں ''ہنامی'' کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ ''پھول تکنا'' ہے۔جاپان کے کیلنڈر میں سال کا سب سے اہم تہوار بھی کہلاتا ہے۔گرچہ ہر شہر اور ضلع میں پھول کھلنے کی تاریخ مختلف ہوتی ہے،جس کی بنیاد موسمی درجہ حرارت ہوتا ہے۔جاپان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں چیری کے درختوں کا ایک چمن ضرور ہوتا ہے،اس کے علاوہ دریاں،نہروں اور ندیوں کے کنارے چیری بلاسم دیکھنے کے لئے لوگ چٹائیاں بچھا کر انہی درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں اور یہی کھاتے پیتے اور موج مستی کرتے ہیں۔مئی کے پہلے ہفتے میں ٹیولپ کا تہوار منعقد ہوتا ہے۔یہ تہوار ایک چھوٹے سے قصبے ''تونامی'' میں انعقاد پذیر ہوتا ہے۔ایک صدی سے پرانی یہ روایت بھی اس سال جاری نہ رہ سکے گی۔وبا کے پھیلاؤ کے خدشے کے پیش نظر ٹیولپ کی نمائش کا تہوار بھی منسوخ کر دیا گیا ہے۔جس میں دہائیوں سے لوگ جاپان

کے کونے کونے سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ ہالینڈ سے ٹیولپ کی درآمد کی کہانی اور پوری دنیا میں اس کے پھیلاؤ سے متعلق داستان کواسی قصبے تو نامی کے ایک میوزیم نما چمن میں محفوظ کیا گیا ہے۔ ہر سال سیاحوں کے لئے بہار کے دنوں میں کھولا جاتا تھا۔مگر اس بار ایسا نہیں ہوگا۔

موذی وائرس کرونا کے سبب باغوں کے اجڑنے کا مفہوم ہی تبدیل ہوکر رہ گیا ہے۔اب محسوس ہوتا ہے کہ چمن کی غارت گری کی وجہ فقط پھولوں، پیڑوں اور سبزے کی پامالی ہی نہیں ہے۔گلشن میں سیر کو آنے اور پھولوں کے حسن کی داد دینے والے باقی نہ رہیں تو پھر باغ بھی اجڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔چمن اہلِ چمن سے ہی آباد لگتے ہیں۔محسوس ہوتا ہے کہ گل ولالہ کی پامالی ہی گلستان کے نوحے کا واحد موجب نہیں ہے۔ پھول تو اس بار بھی شاخوں پر ویسے ہی جھوم رہے ہیں جیسے ہزاروں سال سے بہار کی آمد پر جھومتے آئے ہیں۔مگران پھولوں کے حسن کی داد دینے والے گھروں میں قید ہوگئے ہیں۔اہل گلشن اس بار سیر کے لئے نہیں نکل رہے بلکہ قرنطینہ میں چلے گئے ہیں۔قارئین کے لئے شائد یہ بات دلچسپی کا باعث ہو کہ لفظ ''کورنٹینا'' یا پھر''قرنطینہ'' کی ابتداء مسلم سائنسدان بوعلی سینا سے منسوب ہے۔وجہ تسمیہ کورنٹینا کی یہ ہے کہ اس عہد ساز مسلم طبیب وکیمیادان کا خیال تھا کہ بعض سنجیدہ بیماریوں میں مبتلا مریض ایسے وبائی جراثیم کے حامل ہوتے ہیں۔جو کہ صحت مند افراد کو بھی منتقل ہوسکتے ہیں۔لہٰذاوہ بعض امراض میں مبتلا افراد کو چالیس روز کے لئے علیحدہ کرلیا کرتا تھا۔تاکہ صحت مند افراد میں بیماری کے جراثیم منتقل نہ ہوں اوروہ محفوظ رہیں۔ایک مقصد یکسوئی سے مریض کا علاج بھی تھا۔چالیس دن کے تخلیے کے طریقہ علاج کو''اربعینہ'' کہا جاتا تھا۔جب وینس کے تاجروں نے اس طریقہ علاج کی اثر پذیری دیکھی تو اسے اٹلی میں لے گئے اور اپنالیا گیا۔اطالوی زبان میں چالیس کو ''کورنتا'' یا''قرنط'' کہتے ہیں۔اسی لئے''قرنطینہ'' کی اصطلاح وجود میں آئی۔اس کی مقبول عام ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہسپانوی اور پرتگیزی زبان میں بھی چالیس کو''قرنطہ''ہی کہتے ہیں۔لہٰذا اس کامل تنہائی میں صحت کی بحالی تک وقت گزارنے کے طریقہ علاج کے لئے''قرنطینہ'' کا لفظ رائج ہوگیا۔بوعلی سینا کا''اربعینہ'' ہو یا آج کا''قرنطینہ'' موثر ہونے کے باوجود سوہان روح ہیں۔خدا کرے کہ تمام عالم کو کورونا وائرس اور قرنطینہ سے جلد نجات ملے۔کاروبار دنیا پھر سے

بحال ہواور باغوں میں پھر سے لوگ پھولوں کے حسن کی داد دینے کے لئے سیر کو نکل سکیں۔جس اداسی اور پریشانی میں یہ فصل بہار گزر ری ہے،آئندہ کبھی ایسی بہار نہ آئے۔

مائی بیگ چیلنج

رواں ماہ کے آغاز کے ساتھ ہی جاپان میں ایک نیا قانون نافذ العمل ہو گیا ہے۔اس نئے ضابطے کے مطابق سودا سلف یا کسی بھی چیز کی خریداری کے ساتھ بلا معاوضہ دیا جانے والا پلاسٹک شاپنگ بیگ اب مفت نہیں دیا جائے گا۔ماحولیاتی آلودگی کو کم کرنے کے لئے دیگر مہذب ممالک کی طرح جاپان کی حکومت بھی گاہے بگاہے اقدامات کرتی رہتی ہے۔تازہ ترین اقدام جو یکم جولائی سے عملی طور پر پورے ملک میں نافذ ہو چکا ہے،اس کے تحت اب کسی بھی دکان یا سٹور سے جب خریداری کر کے معاوضہ ادا کر دیتے ہیں تو اس وقت خصوصی طور پر آپ سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا آپ کو پلاسٹک شاپنگ بیگ درکار ہے؟اس کی قیمت آپ کو الگ ادا کرنی پڑے گی،کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے؟اس پنچائیت نما مکالمے کا مقصد پانچ ،دس روپے کی اہمیت اجاگر کرنا نہیں ہوتا جو کہ اب الگ سے ادا کرنی پڑتی ہے۔اس کا مقصد یہ احساس دلانا ہے کہ پلاسٹک شاپنگ بیگ کا استعمال بری عادت ہے ۔کیا آپ مجبور ہیں کہ ضروری طور پر اسے استعمال کرنا ناگزیر سمجھتے ہیں؟

فروخت شدہ سامان کی قیمت وصول کرنے کے بعد سوال و جواب کا مطلب ہے کہ آپ شاپر کا کوئی متبادل اختیار کر لیں تو بہتر ہوگا۔ادائیگی کے کاؤنٹر کے ساتھ ہی کپڑے اور دیگر ماحول دوست مواد سے تیار کردہ بیگ فروخت کرنے کے لئے دستیاب ہیں،جنہیں بار بار استعمال کیا جا سکتا ہے۔جاپان میں ربع صدی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تدریس کے فرائض سر انجام دینے

والے ہمارے ادیب دوست تبسم کاشمیری کا ماننا ہے کہ جاپانیوں کے باطن کو سمجھنا بہت ہی مشکل ہے ۔ایک ذاتی واقعے سے شائد میں اپنی بات کی وضاحت کر سکوں کہ اشاروں ، کنایوں کی اس سماج میں کیا اہمیت ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ جاپان میں میری آمد سے پیشتر ہی بڑے بھائی جان نے میری رہائش کا انتظام کر دیا تھا۔ٹوکیو سے دور یہ گھر کافی بڑا تھا۔اور میرے دفتر کے قریب بھی تھا۔مکان کے سامنے چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا،جس میں چند درخت اور مختلف طرح کے پودے لگے ہوئے تھے۔میں کاروباری مصروفیات میں الجھ گیا اور اس لان کے پیڑ، پودے اپنی رفتار سے بڑھتے بڑھتے کافی بڑھ گئے ۔ایک دن دفتر سے واپس آ کر یہ حسین منظر دیکھا کہ میرے باغیچے کے تمام پیڑ ، پودوں کی احسن انداز میں تراش خراش ہو چکی ہے۔میں نے سمجھا کہ شائد یہاں کی بلدیہ یا مقامی حکومت باغیچوں کے بیل بوٹوں کی تراش خراش کا کام کرتی ہوگی ۔ان دنوں چونکہ نیا نیا جاپان آیا تھا اور سو طرح کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا تھا اسلئے گھر کے آنگن اور روش کے پیڑ پودوں کے حسن کی داد دیکر انہیں بھی فراموش کر دیا۔وقت گزرا اور بہار کے دن آ گئے ۔بہت تیزی سے بڑھتے ہوئے بے ہنگم سبزے کو ایک شام پھر بڑے قرینے سے تراشا ہوا خوبصورت ترتیب میں دیکھا تو جی بہت خوش ہوا۔میں اس حسین منظر سے لطف اندوز ہو ہی رہا تھا کہ میری ہمسائی بڑھیا آن ٹپکی ۔میں نے جاپانی انداز میں جھک کر اسے سلام کیا مگر بڑھیا بغیر لمبی تمہید کے مجھ سے کہنے لگی کہ میں نے اس بار بھی تمہارا لان تراش کر ٹھیک کر دیا ہے،مگر اگلی بار تمہیں یہ کام خود کرنا ہوگا۔

سمندروں، دریاؤں اور جنگلوں میں پلاسٹک بیگ کی وجہ سے جو آلودگی پھیل رہی ہے اس سے قدرتی مناظر کا حسن نہ صرف گہنا رہا ہے بلکہ آبی جانوروں کی زندگی بھی خطرے سے دوچار ہو رہی ہے ۔قومی سطح پر یہاں گرچہ نوے ٹن پلاسٹک فضلے میں شاپر کا حصہ بہت تھوڑا ہے مگر المیہ یہ ہے کہ یہ صرف ایک ہی مرتبہ استعمال ہوتا ہے اور اپنے وزن سے زیادہ آلودگی پھیلانے کا موجب ہے۔کہیں آبی بہاؤ میں رکاوٹ کا سبب ہے تو کہیں مچھلیاں اس کی وجہ سے موت کا شکار ہو رہی ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے حکومتی اقدام اور اس کی عملداری کا ذکر کیا ہے۔اب ذرا سماج اور میڈیا

میں اس اقدام پر ردعمل کا جائزہ لیتے ہیں۔ جہاں تک قیمتاً پلاسٹک بیگ الگ طور پر خریدنے کا تعلق ہے، وہ تو عوام کی کسی حد تک مجبوری بھی کہی جاسکتی ہے، چونکہ یہاں جو بھی، جیسا بھی قانون بن جائے۔اس کی صد فیصد عملداری یقینی ہوتی ہے۔عوامی ردعمل جو میڈیا کے ذریعے سامنے آیا ہے وہ بڑا دلچسپ ہے۔آج کل ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سوشل میڈیا پر لوگوں نے ''مائی بیگ چیلنج'' کے نام سے ایک زبردست سلسلے کا آغاز کیا ہے۔اس ''ذاتی تھیلا چنوتی'' کی تفسیر یوں ہے کہ اب لوگ پلاسٹک بیگ کی جگہ کپڑے یا پھر کسی ماحول دوست میٹریل سے بنائے گئے بار بار استعمال کے قابل تھیلے کا استعمال کرنے لگے ہیں۔اسی طرح کے تھیلے معاشرے میں فروغ پا جائیں، اس مقصد کے تحت ''مائی بیگ چیلنج'' میں ہر کوئی اپنا تھیلا دکھا رہا ہے۔جس میں وہ اب گھر کا سودا سلف اور دوسرا ضروری سامان بازار سے لے کر آرہا ہے۔روزانہ کئی کئی گھنٹوں کی نشریات اس 'ذاتی تھیلا چنوتی'' کے لئے مخصوص ہیں۔سیلیبریٹز اور مشاہیر اپنا اپنا سودا ڈھونے کا تھیلا دکھا رہے ہیں۔کچھ خود اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ تھیلوں کی تشہیر کررہے ہیں۔کہیں کہیں یہ ''میرا تھیلا چیلنج ''یوں نظر آتا ہے، جیسے ''میرا تھیلا میری مرضی'' یوں ماحولیاتی تحفظ کے لئے پلاسٹک شاپر سے چھٹکارے کے لئے اس کی اہمیت وافادیت اجاگر کررہے ہیں۔

جن دنوں میں گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کررہا تھا تو وہاں ماحولیاتی تحفظ کے لئے ایک متحرک انوارنمنٹ پروٹیکشن سوسائٹی ہوا کرتی تھی، جس کا میں سیکرٹری تھا۔اس تنظیم سے وابستگی کے سبب ہی شائد میں آج کا کالم تحریر کررہا ہوں۔ایسی تنظیمیں تمام تعلیمی اداروں میں بننی چاہئیں تاکہ ماحولیاتی آلودگی کے مسائل سے متعلق طلباء کو شعور وآگہی بخشی جائے۔جس سے وہ آئندہ زندگی میں اس معاملے کو سنجیدگی سے لیں۔ریاست کے علاوہ میڈیا کا بھی یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ معاشرے کے مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے عوامی شعور اجاگر کرنے کی اس بابت مہم چلائیں۔

میرے خیال میں ہمیں اس دن کا انتظار نہیں کرنا چاہئے جب آلودگی کے سبب فضاء میں سانس لینا بھی انسانوں کے لئے ناممکن ہوجائے کسی بڑی تباہی اور المیے کے جنم لینے سے پہلے ہی ہمیں اس زمین کی فضا کو آلودہ کرنا بند کردینا چاہیئے اور اپنے مسکن کو مزید نقصان نہیں

پہنچانا چاہئیے ۔افریقی کہاوت ہے کہ یہ زمین ہمیں اپنے اجداد سے ورثے میں نہیں ملی بلکہ ہمارے بچوں کی ہمارے پاس ایک امانت ہے۔

ایٹمی بمباری کی یادیں اور خطرات

اگست کا مہینہ جاپان میں مرنے والوں کو یاد کرنے کے لئے مخصوص ہے۔ جس طرح ہم لوگ محرم الحرام میں روایتی طور پر اپنے پیاروں کی قبروں کی صفائی ستھرائی اور لیپا لپائی کے لئے جاتے ہیں، یہاں یہ رواج ہے کہ ماہِ اگست میں ہر شخص اپنے آبائی علاقے میں واپس جاتا ہے اور اپنے عزیز واقارب کی قبروں پر حاضری کے علاوہ ان کی دیکھ بھال اور مرمت کا کام بھی کرتا ہے۔ جاپانی قبرستان پتھروں سے تراشیدہ قبور پر مشتمل ہوتا ہے۔ کنکریٹ کے فرش پر قدِ آدم اونچائی اور ایک مربع میٹر رقبے میں قبر کا پتھر سے تراشیدہ تعویز ہوتا ہے۔ قبر کو سمادھی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ مردے کو جلانے کے بعد اس کی استھیاں اور باقیات ایک چھوٹے سے مٹکے میں بند کر کے اس قبر میں رکھی جاتی ہیں۔ اس سمادھی کی اوسط قیمت پاکستانی روپے میں تیس لاکھ کے قریب ہوتی ہے، مہنگی اقسام کی قبریں تو کروڑوں میں بنتی ہیں۔ یہاں مگر ہر خاندان کی ایک ہی سمادھی ہوتی ہے، اس میں ہر مرنے والے کا مٹکا رکھ دیا جاتا ہے۔ سکول کے بچوں کو پورا مہینہ چھٹی ہوتی ہے۔

دفاتر میں کیلنڈر کی تو کوئی چھٹی نہیں ہوتی، لیکن ہر ادارہ اپنی سہولت کے مطابق چار، چھ دن یا پھر ہفتے بھر کی چھٹیاں مناتا ہے۔ ان چھٹیوں کا مقصد ملازمین کو اپنے آبائی علاقوں میں جانے کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے۔ روایتی لباس میں ملبوس طبل وعلم بردار نوجوان جلوس نکالتے ہیں، ہر بستی بستی نگر نگر نکلنے والے ان جلوسوں کا رنگ تعزیے کی بجائے عرس کا ہوتا ہے۔ اس تفاوت کی وجہ

موت اور حیات کا مذہبی تصور ہے۔اس برس کرونا وبا Covid-19 کے سبب روایتی گہما گہمی اور جوش وخروش سماجی فاصلوں کے احتیاطی اصولوں کی نذر ہوگیا ہے ۔اگست کے مہینے میں ''اوبون'' نامی اس تہوار کو منانے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم میں امریکہ نے اسی مہینے کے دوران ہیروشیما اور ناگا ساکی پر ایٹمی بمباری کی تھی۔جس سے لاکھوں کی تعداد میں ہلاکتیں ہوئی تھیں۔امریکی ایٹم بموں کے نتیجے میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے لوگوں نے جس آفت کا سامنا کیا،اس کے لئے المیے کا لفظ بہت چھوٹا لگتا ہے۔چشم زدن میں لاکھوں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔آگ کے شعلوں اور تابکار شعاعوں سے زندہ بچ جانے والوں میں لاکھوں انسان ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئے۔ایٹم بم کے نتیجے میں آنے والی ہولناک تباہی ایک ہی دن کی بپتا نہیں تھی۔برسوں بعد پیدا ہونے والے کئی بچے ایٹمی تابکاری اثرات کی وجہ سے معذور پیدا ہوتے رہے۔اس مرگِ انبوہ کا مشاہدہ کرنے والے بہت سارے لوگوں نے وحشت کی وجہ سے کئی دہائیوں تک ایک لفظ بھی منہ سے نہیں بولا،پیہم خاموش رہے۔خوف،دہشت اور کرب کے اثرات زندہ بچ جانے والوں میں 75 (پچھتر) سال بعد،آج بھی دیکھے اور محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

جاپانیوں نے ایٹمی بمباری کے نتیجے میں ہنستے ،بستے شہروں کو جل کر راکھ ہوتے دیکھا۔ایسی تباہی کہ جس کی نظیر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے دنیا میں کہیں نہیں ملتی،نہ ہی اس کے بعد کسی انسانی بستی نے ایسی بربادی کا سامنا کیا۔اس قوم نے مگر ہیروشیما اور ناگاساکی کی راکھ پر بیٹھ کر گریہ و ماتم پر ہی اکتفا نہیں کیا،نئے جذبے سے سرشار ہو کر تعمیرِ نو کی ایسی بھرپور مہم شروع کی کہ آج تک جاری محسوس ہوتی ہے۔ایسا بھی نہیں ہوا کہ جاپانیوں نے ماضی کو یکسر فراموش کر دیا۔روایت پسندی اور جدیدیت کا ایسا خوبصورت امتزاج شاید ہی دنیا کے کسی اور معاشرے میں نظر آئے جیسا جاپان میں ملتا ہے۔اچھی بات یہ ہے کہ یہ دونوں رنگ مکمل مفاہمت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

دنیا میں اس وقت موجود ایٹمی ہتھیاروں کی کل تعداد کا صحیح تخمینہ لگانا تو کافی مشکل ہے،مگر دس ہزار جوہری ہتھیار ماہرین کے نزدیک ہائی الرٹ پوزیشن میں ہیں،جو کسی بھی وقت فائر کئے

جاسکتے ہیں۔ جوہری ہتھیاروں کے مجموعی عالمی ذخائر کا 93 فیصد حصہ امریکہ اور روس کے پاس ہے۔ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں شائع شدہ ماہرین کی رائے کے مطابق پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد کا اندازہ 120 اور 140 کے درمیان ہے، جبکہ ہندوستان کے پاس 110 کے آس پاس جوہری ہتھیاروں کا ذخیرہ موجود ہے۔ عالمی ماہرین کی رائے ہے کہ پاکستان کے ایٹمی ذخائر ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ چین کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کی موجودہ تعداد کا اندازہ 250 کے قریب ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ چین کے ایٹمی اسلحے کے ذخائر پاکستان اور بھارت کے مجموعی ذخائر کے برابر ہیں۔

ان دنوں چین اور ہندوستان کے درمیان بڑھتی ہوئی سرحدی کشیدگی کی وجہ سے عالمی سطح پر بہت تشویش پائی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں متحارب ممالک ایٹمی قوت رکھتے ہیں۔ جنگ کی صورت میں تزویراتی ماہرین کا خیال ہے کہ پاکستان کا غیر جانبدار رہنا ممکن نہیں ہوگا۔ جنگ کی صورت میں دنیا کی کل آبادی کا چالیس (40) فیصد حصہ جو ان تین ممالک میں آباد ہے براہِ راست ایٹمی بمباری کی لپیٹ میں آجائے گا، جو کہ یقیناً ایک خوفناک منظر نامہ ہے۔ ایٹمی بمباری کے نتیجے میں ہیروشیما اور ناگاساکی شہر کے مکین جس اذیت اور کرب سے گزرے خدا کرے ایسی تباہی دنیا کی کسی اور بستی کے مکینوں کو نہ دیکھنی پڑے۔

یادگار تقریب رونمائی

قائداعظم اوران کے رفقاء نے پاکستان کی بنیاد دوقومی نظریے پر رکھی تھی۔قائد کی سوچ یہ تھی کہ برصغیر میں ہندواور مسلمان دوالگ الگ قومیتیں ہیں۔ برصغیر میں بسنے والی مسلم آبادی ایک ملت ہے۔قیامِ پاکستان قائداعظم کے نظریےاورسوچ کی فتح کی علامت ہے۔ پاکستان کے خلاف سازش ضیاء شاہد کی تازہ تحریر ہے،اس کتاب میں انہوں نے مستند تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کیاہے کہ ہماری سرزمین پر جوبھی قابل ذکر سیاسی جماعتیں دوقومی نظریےاور قائداعظم کی سوچ کی بجائے زبان، رنگ نسل یا پھر جائے پیدائش کی بنیاد پر قائم ہوئی ہیں، وہ بالآخر پاکستان دشمنی پر منتج ہوتی آئی ہیں۔ جذبہ حب الوطنی میں ڈوبے مضامین پر مشتمل یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کتاب کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ’’پاکستان کے خلاف سازش‘‘ کی جاپان میں بھی تقریب رونمائی کروائی جائے۔اگرچہ پاکستان میں متعدد مقامات اور نیویارک کے علاوہ لندن میں بھی اس کتاب کی تعارفی تقاریب منعقد ہوچکی ہیں،مگر دس ہزار تارکین وطن پاکستانیوں کی موجودگی کے سبب جاپان میں اس کی تقریب رونمائی کی ایک اپنی اہمیت ہے۔اس پروقار تقریب کے لیےتویاما کے دل ریستوران کاانتخاب کیا گیا،جس نے محفل کا مزہ دوآتشہ کردیا۔جگہ کےاس انتخاب کی وجہ گردونواح میں بسنے والے پاکستانیوں کی کثیر تعداد ہے،ان کی اکثریت ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے وابستہ ہے۔نمازِعصر کے بعد تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔روزنامہ خبریں کے بیورو چیف کی حیثیت سے میں نے شرکاء محفل کا شکریہ ادا کیا، جوکہ

چھٹی کے دن اپنی گھریلو اور نجی مصروفیات کو ترک کر کے اس تقریب میں اتنی بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ علاوہ ازیں راقم نے خطبہ استقبالیہ کے علاوہ پاکستان کے خلاف سازش کا مختصر تعارف پیش کیا۔ علامہ طاہر حسین پہلے مقرر تھے، انہوں نے بڑے بھرپور اور جذباتی انداز میں ضیاء شاہد کو لسانیت اور عصبیت کے خلاف قلم اٹھانے اور دو قومی نظریے کو اجاگر کرنے پر خراج عقیدت پیش کیا۔ اگلے مقرر سینئر پاکستانی سماجی کارکن ایم اعجاز بٹ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مدینہ کی ریاست کے قیام کے بعد پاکستان تاریخ کا واحد ملک ہے۔ جو اسلام کے نام پر دو قومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے۔ پاکستان کے خلاف سازش تحریر کر کے ضیاء شاہد نے پاکستان اور دو قومی نظریے کی زبردست خدمت کی ہے۔ اس کتاب کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی سی ہے۔ حافظ عبدالواحد کا کہنا تھا کہ یہ کتاب ایک دردمند پاکستانی کے دل کی آواز ہے، جس سے یہ جذبہ حب الوطنی چھلکتا ہے۔ ضیاء شاہد کے دل میں پاکستان اور اسلام کی محبت بستی ہے۔

مقررین نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے پاکستان کے خلاف سازش کرنے والے ان کرداروں پر بھی تفصیل سے گفتگو کی جن کو اس کتاب میں موضوع بنایا گیا ہے۔ الطاف حسین کے حالیہ بیانات سے لیکر خدائی خدمت گار اور بلوچستان کے سرداروں پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ زاہد شفیق بٹ نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کے سربستہ رازوں میں ایک راز ہے اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس کی حفاظت کرے گا۔ پاکستان کے خلاف سازشیں کرنے والے ہمیشہ ناکام اور ذلیل ورُسوا ہوں گے۔ وطن عزیز کو نقصان پہنچانے کی سازش کرنے والے مکروہ چہروں کو بے نقاب کر کے مصنف نے کلمہ جہاد بلند کیا ہے۔ مقررین نے اس پہلو پر بھی گفتگو کی کہ سیاستدانوں کا یہ سازشی ٹولہ چونکہ بہت خطرناک اور اخلاقی اعتبار سے پست لوگوں پر مشتمل ہے اس لیے اللہ تعالیٰ ضیاء شاہد کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ جو لوگ اپنی دھرتی کے خلاف سازش کر سکتے ہیں، ان سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ ظفر حنیف نے محرم الحرام کے ایام عزاء کی نسبت سے کہا کہ ظلم کے خلاف مزاحمت کا راستہ امام حسینؑ کا راستہ ہے۔ اس بنیاد پر جہاں ظلم وہاں خبریں کا نعرہ مستانہ بلند کر کے ضیاء شاہد نے مظلوموں کی حمایت کا جو راستہ چنا ہے وہ انتہائی قابلِ ستائش ہے اور پاکستان کے خلاف سازش کی اشاعت ان کی اسی جدوجہد کا حصہ نظر آتی ہیں۔ خورشید خان کا کہنا تھا کہ پا

کستان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اگر وطن کے خلاف سازشیں کرنے والے موجود ہیں تو وہاں ضیاء شاہد جیسے محبّ وطن سپوت اور لکھاری بھی موجود ہیں جوان سازشوں کو ناکام بنانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔اس تقریب کے انعقاد میں خبریں کے ساتھ راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل نے بھی اشتراک کیا تھا جو کہ علم وادب کی ترویج اور صحت مند انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے عالمی سطح پر سرگرم عمل ہے۔تقریباً تمام مقررین نے اس پروقار تقریب کو تاریخی اور تازہ ہوا کا جھونکا قرار دیا۔ اگر چہ اردو زبان جاپان میں اجنبی نہیں ہے۔آپ حیران ہوں گے کہ اردو کی پہلی لغت جاپان میں 1796ء یعنی دوصدیوں سے بھی پہلے تیار کر لی گئی تھی۔ٹوکیو یونیورسٹی میں شعبہ اردو قیام پاکستان سے کئی دہائیاں قبل قائم ہو چکا تھا، اگر چہ اس وقت اس کو ہندوستانی زبان کا شعبہ کہا جاتا تھا۔ غالب، علامہ اقبال سے لیکر فیض احمد فیض تک بہت سے شعراء کا مکمل کلام اس شعبے نے جاپانی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔اوساکا یونیورسٹی میں بھی اردو زبان کا شعبہ موجود ہے اور بھرپور انداز میں اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔پچاس کے لگ بھگ جاپانی طلبہ وطالبات یہاں اس وقت اردو سیکھ رہے ہیں۔سائتاما شہر کی دائتوبنکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا تذکرہ نہ کرنا زیادتی ہوگی،اس تمام تر تفصیل کے باوجود معیاری ادبی اور صحافتی تقاریب یہاں خال خال ہی منعقد ہوتی ہیں۔اسی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے مقررین نے اس تقریب کو جہاں منفرد قرار دیا،سامعین نے بھی اسے استثنیات میں گردانا۔علامہ طاہر حسین پہلے مقرر تھے اور جس جذباتی انداز میں انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا اس نے آخر تک سامعین کو متوجہ رکھا۔ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کے خلاف سازش جیسی کتاب کی ہمیں اشد ضرورت تھی کیونکہ ایک بار پھر پاکستان کے خلاف سازش کرنے والے عناصر سرگرم عمل ہیں۔یہ بھی فرمایا کہ خبریں کی اشاعت سے پہلے پاکستانی صحافت حکمرانوں کی خوشامد اور طبقہ اشرافیہ کی چاپلوسی پر مبنی تھی،خبریں نے اسے ظلم کے خلاف آواز بنا دیا۔ضیاء شاہد نے اردو صحافت کو ایک نئی جہت اور ولولہ انگیز لہجہ عطا کیا ہے۔تقریب رونمائی کے اختتام پر عشائیے کا انتظام کیا گیا تھا۔کھانے کے دوران بھی شرکا محفل کا موضوع گفتگو پاکستان کے خلاف سازش اور ضیاء شاہد کا جرات مند طرز تحریر تھا۔پاکستان پر احسان کہنے سے جھجھک رہا ہوں، کیونکہ ملک تو ماں کی طرح ہوتا ہے۔اور ماں پر تو کوئی بھی خدمت احسان نہیں ہوتی،مگر پاکستان کیخلاف سازش تحریر کر کے ضیاء شا

ہد نے دھرتی کے حقیقی سپوت ہونے کا ثبوت ضرور دیا ہے۔اس کتاب کے مندرجات اورتقریب رونمائی میں اس تحریر کے متعلق لوگوں کا جوش وخروش دیکھ کر یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب تاریخ میں زندہ رہنے والی کتابوں میں سے ایک ہوگی۔

سالِ نو اور جاپان

کرسمس کا دن مسیحی دنیا میں خاندان سے متعلق ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں کرسمس کا عشائیہ اس تہوار کا سب سے اہم اور بنیادی رکن ہوتا ہے۔ جسے تمام لوگ عموماً اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ مناتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دن ہونے کے سبب مذہبی رجحان رکھنے والے خاندان کرسمس کی صبح گرجا گھر جاتے ہیں جہاں خصوصی دعائیہ تقریب ہوتی ہے۔ اس دن ولادت مسیح کے مختلف پہلوؤں پر پادری اپنے اپنے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ کرسمس اگرچہ اب مذہبی سے زیادہ سماجی تہوار بن گیا ہے مگر پھر بھی اس کا تشخص اور تقدیس اب بھی روحانی نوعیت کی ہے۔ نیوائیر کا معاملہ بالکل ہی مختلف ہے، اس کا نقش رات کے بارہ بجے، باہر سڑکوں پر گھڑی کی بالائی جانب گھنٹوں اور منٹوں کی سوئیاں اکٹھی ہونے کے انتظار کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آتش بازی اور پٹاخے شروع ہو جاتے ہیں، لوگ شہر کے مرکز میں خوشی سے جھومتے اور نعرے لگاتے ہیں، من چلے نئے سال کے نام جام ٹکراتے ہیں۔ ان ساعتوں میں عشاق پیمانِ وفا باندھتے ہیں۔ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کرسمس ان ڈور اور آمدِ سالِ نو کا جشن آؤٹ ڈور تہوار ہیں۔

جاپان میں عیسائی عقیدہ رکھنے والے لوگوں کی تعداد کل آبادی کا ایک فیصد بھی نہیں ہے، مگر کرسمس ٹری سجے سجائے آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے۔ تمام ہوٹل، شاپنگ مال، دوکانیں، بازار کرسمس کی روشنیوں سے ٹمٹماتے نظر آتے ہیں۔ لوگوں میں بالکل وہی جوش و جذبہ نظر آتا ہے جو مسیحی اکثریتی آبادی والے ممالک میں نظر آتا ہے۔ روشنیوں اور رنگوں کا ایک دریا سرِ شام بہنا

شروع کر دیتا ہے۔ گو کہ چراغاں کی ابتدا نومبر کے آخر میں شروع ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ جنوری کے اواخر تک چلتا ہے، مگر اس کا نقطہ عروج کرسمس اور نیو ائیر ہی ہے۔ کرسمس ٹری کے ساتھ جا بجا سانتا کلاز کے مجسمے سجے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سرخ وسفید لباس میں ملبوس، سفید گالا داڑھی اور عینک والے مہربان بزرگ سانتا کلاز کی سواری کی سج دھج، جس میں بچوں کے لیے تحائف لدے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ تحائف سے بھری کوچ اور اس کو کھینچنے والے بارہ سنگھے کے ماڈل جگہ جگہ رنگ وروشنیوں سے منور نظر آتے ہیں۔ بازار سے گزرتے ہوئے سرد ہواؤں کے ساتھ ان دنوں کرسمس اور نئے سال سے منسوب مدھر گیت دور و نزدیک سے سماعتوں سے ٹکراتے ہیں۔ کرسمس ٹری پر سجے لٹکتے آرائشی تحفے، رنگ برنگے ربن میں لپٹے، سرخ اور سبز ڈبوں میں بند اس کرسمس ٹری کے اردگرد بکھرے بہت سے مزیدار تحائف جنہیں بچے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

کرسمس اور سال نو کی لوٹ سیل کے تذکرے کے بغیر تو اس موضوع پر بات نامکمل ہی رہے گی۔ سرمایہ دارانہ نظام نے مذہبی نوعیت کے تہوار اور روحانی ایام کو کاروبار کے ساتھ اس طرح منسلک کیا ہے کہ سارا سال لوگ کرسمس سیل کا انتظار کرتے ہیں۔ جاپان جیسے بدھ مت اکثریتی ملک میں تو کرسمس کے سارے جشن کی بنیادی وجہ ہی کاروباری نوعیت کی ہے۔ اسی کارپوریٹ مفاد کے تحت جاپان میں کرسمس اور نئے سال کی رونقیں مسیحی ممالک کو بھی مات دیتی نظر آتی ہیں۔ ان دنوں کی لوٹ سیل پوری دنیا میں مشہور ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بھی قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوسکتا ہے کہ مشرقی یورپ اور روس کے علاوہ آرتھوڈوکس عیسائی مسلک کے لوگ جہاں بھی آباد ہیں وہ کرسمس کا تہوار سات جنوری کو مناتے ہیں۔ اس بارے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی اس وقت جو کیلنڈر رائج تھا۔ اس کے مطابق یہ دن سات جنوری ہی بنتا ہے۔ بنیادی نقطہ یہ ہے کہ آرتھوڈوکس اور کیتھولک عیسائی نئے سال کے ساتویں دن میلاد مسیح مناتے ہیں، رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ سمجھتے ہیں کہ یہ نئے سال سے پہلے یعنی 25 دسمبر کا دن ہے جبکہ روسی، یونانی آرتھوڈوکس اسے گریگورین کیلنڈر کے مطابق 7 جنوری کو مناتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ فلسطین کے جس مقام پر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی اور اب وہاں کلیسا قائم ہے، وہاں بھی کرسمس 7 جنوری کو منائی جاتی

ہے۔

لاطینی امریکہ میں دیکھا کہ دسمبر کے پہلے ہفتے سے ہی کرسمس کے جلوس نکلنا شروع ہوجاتے ہیں۔گاڑیوں کے یہ قافلے ریلی کی صورت میں ہوتے ہیں۔ان میں سانتا کلاز اور کرسمس سے منسوب مختلف کرداروں کے لباس میں ملبوس لوگ گولیاں، ٹافیاں، اور چاکلیٹ بچوں میں تقسیم کرتے جاتے ہیں۔کرسمس اور نئے سال کے گیتوں کی دھنوں پر جھومتے گاتے لوگ راستے میں ملنے والے لوگوں کی جانب ہاتھ ہلاتے جاتے ہیں اور کرسمس کے تحائف تقسیم کرتے جاتے ہیں۔رضا کارانہ طور پر ان جلوسوں میں شامل لوگ اپنی گاڑیوں پر غبارے لگاتے ہیں اور میلا د مسیح مبارک لکھوا کر چلتے ہیں۔جلوس کے راستے میں آنے والے گھروں کی گھنٹیاں بجا کر بچوں کو سانتا کلاز کے لباس میں ملبوس افراد مٹھائیاں بانٹتے ہیں۔روزانہ نکلنے والے ان جلوسوں کا نقطہ عروج 25 دسمبر ہوتا ہے
۔

ان دنوں نئے سال کے کیلنڈروں اور ڈائیریوں کے تحائف دفاتر میں روز موصول ہوتے ہیں۔دوست احباب ان تحائف کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔محبت کرنے والے ان دنوں نئے سرے سے عہدِ وفا باندھتے ہیں۔کرسمس پر اگر برفباری ہوجائے تو اسے ''وائیٹ کرسمس'' کہتے ہیں۔برفباری سے اگرچہ سردی میں تو مزید اضافہ ہوجاتا ہے مگر نوجوان منچلے اس سردی اور برفباری کو انجوائے کرتے ہیں۔کرسمس اور نئے سال کے درمیانی دنوں میں چھٹی جیسا ماحول ہوتا ہے۔سرکاری طور پر جاپان میں پچیس دسمبر کی چھٹی نہیں ہوتی اور دفاتر معمول کے مطابق اپنے کام سرانجام دیتے ہیں۔مرزا غالب جن کا یوم پیدائش بھی انہی دنوں، ستائیس دسمبر ہے، جس پر گوگل سرچ انجن نے اس بار 220 ویں سالگرہ پر اپنا صفحہ بطور خراج تحسین غالب کے نام منسوب کیا ہے، کیا خوب اس صورت حال کی ترجمانی اپنے لافانی شعر میں کر گئے ہیں۔

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

جاپان کا اردو بازار

کتاب روزمرہ کا اہم جزو ہونا چاہئے۔ مگر پاکستان کے اچھے اچھے اور معتبر لکھاریوں کی کتابیں بھی پانچ سو یا ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں، جو اگر بک جائیں تو پبلشر کتاب کو کامیاب شمار کرتا ہے۔ ہمارے ہاں کتاب کا رواج نہ ہونے کی بے شمار وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو کتاب پڑھنے کا شوق ہے ان کے معاشی حالات عام طور پر کتاب خریدنے کی اجازت نہیں دیتے اور جن کے معاشی حالات اچھے ہیں انہیں عموماً مطالعہ کا شوق نہیں ہوتا۔ ہمارے ہمسایہ ملک ایران میں ہر گھر کے اندر جس طرح باورچی خانہ ضروری ہوتا ہے اسی طرح لائبریری یا کم از کم کتابوں کی الماری گھر کا ضروری حصہ ہے۔ یہاں تک کہ اگر دیوانِ حافظ گھر کی لائبریری میں پہلے سے موجود ہے اور بازار میں اس کا کوئی اور نیا اور بہتر ایڈیشن آ گیا ہے تو گھر کا کوئی نہ کوئی فرد اسے خرید لائے گا۔ یہ بات المیے سے کم نہیں کہ لاہور میں جہاں کبھی پرائیویٹ لائبریریاں ہوا کرتی تھیں، اب وہاں دودھ دہی کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ حالانکہ جس طرح جسم کو اچھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دماغ کو بھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ مطالعے سے ہی فراہم کی جا سکتی ہے۔

بعض دوستوں کا خیال یہ ہے کہ کتاب تو ایک بہانہ ہے اصل میں یہ لوگ آپس میں نظر ملانے سے کتراتے ہیں لیکن اس نقطۂ نظر کی نفی اس بات سے ہو جاتی ہے کہ یہاں سینکڑوں میں شائع ہونے والی ہر کتاب بیرون ملک لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہے۔ کسی بھی ٹرین یا بس

میں سوار ہو جائیں، ہر دوسرے چوتھے آدمی کے ہاتھ میں کتاب نظر آئے گی۔ جو وہاں کتاب کی مقبولیت کا واضح ثبوت ہے۔ اگر ہم صرف جاپان میں چھپنے والے اخبارات ومیگزین اور کتابوں کی مجموعی تعداد دیکھیں تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ہر آدمی اوسطاً روزانہ ایک کتاب یا اخبار ضرور خریدتا ہے۔

قارئین کو بتاتے چلیں کہ دنیا میں کتابوں کی فروخت کا سب سے بڑا مرکز ٹوکیو میں واقع ہے۔ جس میں دس لاکھ سے زائد عنوانات پر کتابیں موجود ہیں۔ ٹوکیو کے علاقے ''کھاندا'' کو جاپان کا اردو بازار کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بازار کی منفرد بات یہ ہے کہ یہاں پرانی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی بے شمار دوکانیں ہیں۔ حال ہی میں سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی فروخت میں اضافے کے لئے ایک تنظیم کتب فروشوں نے تشکیل دی ہے جس کے زیر اہتمام ایک کتابچہ چھاپا گیا ہے جو کہ پورے ملک میں ہر بکسٹال پر دستیاب ہے۔ جس میں ان تمام کتب فروشوں کے تعارف کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متعلق دستیاب کتب کی بنیاد پر ان دکانوں کو تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کوشش کا مقصد نوجوان نسل کو بھی کتاب کی طرف مائل کرنا ہے جو کہ کتاب بینی اور شائع شدہ مواد سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ نوجوان نسل بھی مطالعہ سے دور نہیں ہو رہی بلکہ صرف شائع شدہ مواد سے اس کی رغبت ویسی نہیں جیسی کہ روایتی طور پر اس معاشرے کا خاصہ رہی ہے۔ نئی نسل میں مطالعے کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے اور کمپیوٹر سکرین پر کتابیں پڑھنے کا رواج اس قدر تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ درجنوں کمپنیاں آپ کو کمپیوٹر سکرین پر پسندیدہ کتابیں مہیا کر دیتی ہیں۔ ہر کتاب متعلقہ گاہک کے نام پر ہی خریدی جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے کمپیوٹر پر منتقل یا ڈیجیٹل کیا جاتا ہے۔ جس کا یہ کمپنیاں معقول معاوضہ وصول کرتی ہیں۔ جب سے امریکہ کی ایک کمپنی نے ڈیجیٹل پیڈ متعارف کروایا ہے تب سے کمپیوٹر پر کتابیں فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کاروبار چمک اٹھا ہے۔ ایک کمپنی نے جولائی میں دس ہزار کتابوں کو ڈیجیٹل کر کے گاہکوں کو فراہم کیا۔ اگست کے مہینے میں یہ تعداد پندرہ ہزار کو پہنچ گئی اور ستمبر میں پچیس ہزار کتابوں کے لوگوں نے اس کمپنی کی مدد سے ڈیجیٹل کروایا۔ تاکہ وہ انہیں کمپیوٹر سکرین پر یا پھر سمارٹ فون پر پڑھ سکیں۔ کتاب کو ڈیجیٹل کر کے یہ کمپنیاں گاہک کو ڈی وی

ڈی دے دیتی ہیں۔

اس وقت پبلشرز اور ان کمپنیوں کے درمیان کاپی رائٹ کے حوالے سے قانونی جنگ چل رہی ہے جو کہ خاصی دلچسپ ہے۔لیکن اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔اس لئے ہم ٹوکیو کے سیکنڈ ہینڈ کتب فروشوں کی بات کرتے ہیں جن کا کتابچہ اس وقت میرے سامنے ہے۔جس میں مسکراتے ہوئے بیسیوں کتب فروشوں کی تصاویر اور تعارف موجود ہے۔مصنف لکھتا ہے کہ ''ہم کتب فروش کا ہاتھ میں ڈسٹر پکڑے تند مزاج بوڑھے والا امیج تبدیل کرنا چاہتے ہیں'' گزشتہ شام ایک قصبے میں واقع ایسی ہی کتابوں کی دوکان پر کم وبیش دوسو افراد موجود تھے۔یہ منظر پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں کہ یہاں کی زندگی کے معمولات میں شامل ہے،لیکن اس بار دل میں خیال آیا کہ کتاب سے دوستی کی یہ روایت اگر ہم لوگ بھی اپنا لیں تو معاشرے کی بہت ساری خرابیاں دور ہوسکتی ہیں اور بے شمار آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

ڈرون سے اخبارات کی تقسیم

صبح صبح دروازے پر ہاکر کی دستک، یا پھر گھنٹی کی آواز کے ساتھ اخبار کی فرش پر دھک سے گرنے کی آواز ہمارے گھروں میں نئے دن کے اخبار کی آمد کا پتا دیتی ہے۔ گزشتہ ایک صدی سے دنیا بھر میں گھروں تک اخبارات کم وبیش اسی انداز میں پہنچتے آئے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ اب روایت بدلنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ذرا تصور کیجئے کہ ایک ڈرون آپ کے گھر کی چھت پر آئے اور صحن میں تازہ اخبار کا بنڈل گرا کر واپس چلا جائے۔ افسانوی سی بات لگتی ہے، مگر مستقبل میں شاید اخبار کی ترسیل کا یہی طریقہ کار ہمارے اس عالمِ رنگ وبو میں رائج ہو جائے۔ اب یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے۔ یہاں جاپان میں تو ڈرون نے اخباری ہاکر کا کام شروع کر دیا ہے۔ ہوکائیدو کی ایک اخباری تقسیم کار کمپنی نے اس ہفتے ڈرون طیاروں سے اخبارات کی تقسیم کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ اخبار سے لیس فضا میں معلق ڈرون طیاروں کی شائع ہونیوالی تصویر یہاں کے میڈیا کا محبوب موضوع بنا ہوا ہے۔

بدقسمتی سے ہم پاکستانیوں کے ذہن میں ڈرون طیاروں کے ذکر پر ڈرون میزائل حملے آتے ہیں۔ بیت اللہ محسود، نیک محمد اور ملا اختر منصور کے نام ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ میزائل حملوں سے متاثرہ پاک افغان سرحد سے متصل پہاڑی علاقوں کا تصور ذہن کی سکرین میں ابھرنے لگتا ہے۔ اس میں ہمارا زیادہ قصور بھی نہیں ہے کہ ہمارا اس ٹیکنالوجی سے تعارف ہی جنگ کے حوالے ہوا ہے۔ افغانستان کئی دہائیوں سے عالمی طاقتوں کے لئے جنگ کا تھیٹر بنا ہوا ہے۔ عسکری

اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی طاقتوں امریکہ اور روس کی اس جنگ میں شرکت کے سبب ہم لوگوں کو جدید ترین جنگی ٹیکنالوجی اور سامان حرب سے تعارف ہوتا رہتا ہے۔ ہمسائیہ ملک افغانستان میں لڑی جانے والی جنگ ماضی کے حکمران کبھی تو اپنی خوشی اور رضامندی سے پاکستان کے اندر تک لے آئے اور کبھی کبھی اس جنگ کے شعلے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں جھلسا جاتے ہیں۔ ڈرون طیارے طالبان اور القاعدہ کے خلاف پہلی بار جاسوسی کے لئے امریکہ جنگی میدان میں لے کر آیا۔ چند گھنٹے پرواز کی استطاعت رکھنے والے یہ ڈرون تصویر کشی کرنے کے علاوہ طاقت ور کیمروں کی مدد سے براہِ راست ویڈیو بھی ہیڈ کوارٹر بھیجنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس شعبے میں انقلاب اس وقت آیا جب ان جاسوس ڈرون طیاروں پر میزائل نصب کر دیئے گئے۔ پرواز کا دورانیہ چند گھنٹے سے بڑھ کر چند دن ہو گیا اور اب بات ہفتوں تک مسلسل محو پرواز رہنے تک جا پہنچی ہے۔

بغیر پائلٹ کے محو پرواز ڈرون طیارے افغانستان کی جنگ میں امریکہ کا سب سے موثر ہتھیار ثابت ہوئے ہیں۔ امریکی فوجی اب زیادہ تر اپنی چھاؤنیوں اور ائیر بیس پر بیٹھ کر معاملات چلا رہے ہیں۔ مقامی افغان افراد عسکریت پسندوں کے متعلق اطلاعات امریکیوں کو پہنچا دیتے ہیں اور امریکی ان کی مدد سے ڈرون طیاروں کے ٹارگٹ طے کرتے ہیں، جیسے ہی کوئی مطلوبہ ٹارگٹ ظہور پذیر ہوتا ہے، یہ لوگ اس کو تالا لگا دیتے ہیں، اب یہ ٹارگٹ جہاں بھی جائے ڈرون اس پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہوتا ہے، ریموٹ کنٹرول سے حکم ملتے ہی میزائل داغ دیتا ہے۔ ایک عسکری ماہر دوست نے بتایا ہے کہ اس کنٹرول میزائل میں ٹارگٹ کی غلطی کا امکان پانچ انچ تک ہوتا ہے۔

جی ہاں! فقط پانچ انچ، یعنی اگر میزائل دہشت گرد کے سر پر نشانہ لے کر فائر کیا گیا ہے تو وہ اگر غلطی بھی کرے گا تو زیادہ سے زیادہ اس آدمی کے سینے پر جا کر لگے گا۔ اس سے زیادہ غلطی کا احتمال و امکان نہیں ہے۔ ڈرون طیارے کی مثال ہوائی جہاز سے ملتی جلتی ہے۔ اس کو ایجاد کرنے والے افراد کے ذہن میں اس ایجاد کا مقصد شائد مختلف رہا ہو، مگر عسکری ماہرین نے اس ایجاد کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور آج ان کی جدید شکل F16، F35،

سخوئی اور رافیل سے لے کر ہمارے جے ایف تھنڈر تک ہے ۔جبکہ دوسری طرف بوئینگ 777، 747 اورائیر بس A380 سے لیکر ہنڈا کے پرائیویٹ جیٹ اور شہری ہوا بازی کا پورا محکمہ ہے۔

امریکہ میں ٹیکنالوجی کمپنی ایمازون تو گزشتہ برس سے ہی اپنے گاہکوں کا سامان ان کی دہلیز تک ڈرون طیاروں کی مدد سے پہنچا رہی ہے۔مگر اخبار کی تقسیم کے لئے ڈرون کا استعمال پہلی دفعہ ہوا ہے۔اس پراجیکٹ پر کام تو مذکورہ جاپانی کمپنی کئی ماہ سے کر رہی تھی مگر اس کی ضرورت میں شدت اس وقت محسوس کی گئی جب تین ہفتے پہلے جاپان کے صوبہ ہوکائیدو میں زبردست زلزلہ آیا،زلزلے کی شدت 7 درجے تک ہونے کے سبب بہت اتھل پتھل ہوئی،کئی گھنٹے کے لئے بلیک آؤٹ ہوگیا،نہ بجلی ،نہ گیس ،نہ پانی،نہ ہی ٹیلی فون انٹرنیٹ ۔اس سانحے کے بعد اخباری تقسیم کے اس نجی ادارے نے ایسی ناگہانی صورتحال میں لوگوں تک اطلاعات کی ترسیل کا واحد ذریعہ رہ جانے والے شعبہ ابلاغ کی تقسیم بذریعہ ڈرون کرنے کا فیصلہ کیا۔رواں ہفتے کامیاب آزمائشی پرواز میں ڈرون نے اپنے مقررہ نشانوں پر دس دس اخبارات کے بنڈل پھینکے،جنہوں نے اپنے اہداف کو صد فیصد حاصل کیا۔

ممکن ہے ڈرون کے ذریعے اخبارات کی تقسیم نسبتاً مہنگا سودا ہو،میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے وزیراعظم کے ہیلی کاپٹر کی طرح اس کا خرچہ براستہ سڑک سفر کرنے سے بھی کم ہے،مگر آپ ناگہانی صورت کو ذہن میں لے کر آئیں۔مثال کے طور پر سیلاب ،زلزلہ

،جنگ یا پھر کوئی اور آسمانی آفت آجاتی ہے۔جس کے نتیجے میں سڑکیں اور پل ٹوٹ جاتے ہیں۔زمینی رابطہ لوگوں کا منقطع ہوجاتا ہے۔ایسی صورتحال میں ڈرون سے اخبارات کی ترسیل موثر ترین ذریعہ ہے۔اخبار کی تقسیم کار کمپنی نے کامیاب تجربے کے بعد یہ اعلان کیا ہے کہ وہ مستقبل میں اخبار کی تقسیم کو مکمل طور پر آٹومیٹک کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔یعنی سو فیصد اخبارات خودکار طریقے سے ڈرون طیارے کے ذریعے ہی تقسیم کرنے کی خواہش ہے اس ادارے کی۔طریقہ کار یہ ہوگا کہ ڈرون پر اخبار گول رول کی شکل میں لپیٹ کر مومی لفافے میں لوڈ کردیا جائے گا۔بغیر پائلٹ کے ڈرون طیارے کے کمپیوٹر میں تمام گاہکوں کے ایڈریس ڈال دیئے جائیں گے۔ڈرون طیارہ مقررہ پتے پر کیمرہ کی مدد سے ایڈریس کی تصدیق کر کے اخبار کو ایسے پھینکے گا۔جیسے جہاز بم گراتا ہے۔اس کے بعد وہ اگلے گاہک کا پتا ڈھونڈ کر وہاں اخبار پھینکے گا۔اخبارات کی تقسیم کے بعد یہ اسی جگہ خود بخود واپس آجائے گا جہاں سے پرواز کا آغاز کیا تھا۔

وزارتِ تنہائی

جاپان میں خودکشی کرنے والے افراد کی سالانہ تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ یہ معاملہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ برس ہا برس سے یہی روایت چلی آ رہی ہے۔ انسانی تاریخ میں اجتماعی خودکشی کا سب سے بڑا واقعہ بھی جاپان ہی کے ایک جزیرے پر پیش آیا، جب دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں امریکی فوج ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا چکی تو گھیرے میں آئے ہوئے جاپانی فوجیوں نے سرینڈر کرنے کی بجائے خودکشی کرنے کو ترجیح دی تھی۔ چشم زدن میں 6500 افراد نے خود ہی اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی تھی۔

موجودہ حکومت کی پریشانی اور تشویش کا سبب یہ ہے کہ اس سال خودکشی کرنے والے افراد کی تعداد نے جاپان میں گزشتہ پوری دہائی کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ بدقسمتی سے اس منفی رجحان میں مسلسل تیزی آ رہی ہے۔ قارئین بھی شائد حیران ہوں کہ اس برس جاپان میں کرونا کے وبائی مرض میں مبتلا ہو کر ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد خودکشی کرنے والے افراد کے مقابلے میں تقریباً آدھی ہے۔ حالانکہ جاپان ان ممالک میں شامل ہے جو COVID-19 سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ اکتوبر کے مہینے میں جب کرونا وبا عروج پر تھی تو اس سے متاثر ہو کر ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد سترہ سو تھی، جبکہ اسی عرصے میں خودکشی کا ارتکاب کرنے والے لوگوں کی تعداد تقریباً ڈھائی ہزار کے قریب تھی۔ خودکشی کے مرتکب افراد کا گیارہ سالہ ریکارڈ ٹوٹنے کی وجہ کرونا کے باعث پیدا ہونے والے معاشی اور سماجی مسائل بھی ہیں۔ مگر تنہائی کو اس کا بنیادی سبب

سمجھا جاتا ہے۔ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سرکار نے جاپانیوں کی تنہائی دور کرنے اور سماجی اعتبار سے زیادہ میل جول بڑھانے کی طرف راغب کرنے کے لئے ایک خصوصی وزارت قائم کی ہے۔اس وزارت کو یہاں تنہائی کی وزارت کا نام دیا گیا ہے۔

خودکشی کی شرح میں مسلسل اضافے سے نمٹنے کی کوششوں کے تحت ساکاموتو کو پہلا وزیر برائے تنہائی تعینات کیا گیا ہے۔وزارت تنہائی کو حکومتی پالیسیوں کے ذریعے شہریوں میں تنہائی اور لوگوں کے درمیان الگ تھلگ رہنے کے رجحان میں کمی لانے کا ٹاسک دیا گیا ہے۔نئی وزارت کا چارج دیتے ہوئے وزیراعظم سوگا نے وزیر تنہائی کو بتایا کہ خواتین میں خودکشی کا رجحان مردوں کی نسبت ان دنوں زیادہ بڑھ گیا ہے۔اس بابت ان کا کہنا تھا کہ مردوں کے مقابلے میں خواتین کی زیادہ تعداد تنہائی کا شکار ہے۔اور شائد یہی وجہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے،اس سارے افسوس ناک معاملے میں یہاں آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ وزیر تنہائی کے پاس بچوں کی پیدائش میں کمی سے نمٹنے کی وزارت کا قلمدان بھی ہے۔آپ شائد حیران ہو رہے ہوں گے، چونکہ پاکستان میں تو ہم نے بچپن سے خاندانی منصوبہ بندی کی وزارت اور آبادی میں اضافے کی شدت میں کمی لانے کے وزیر ہی دیکھے ہیں۔ ہر ملک کے اپنے مسائل ہوتے ہیں، جاپان آبادی میں کمی کا شکار ملک ہے۔مستقبل میں یہ سفید بالوں والے افراد کی اکثریت کا دیس بن جائے گا۔یہی رجحان رہا تو پچاس سالوں میں ایک کروڑ آبادی مزید کم ہو جائے گی۔اسی شرح پیدائش میں کمی کے چیلنج سے نمٹنے کے لئے بھی ایک وزارت خصوصی طور پر کام کر رہی ہے۔اور تنہائی کے وزیر موصوف ساکاموتو کی ہی اس وزارت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے۔

وزارت تنہائی کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ اس دیس میں پورے عالم سے زیادہ بلند خودکشی کی شرح ہونے کی اور بھی بہت ساری اہم وجوہات موجود ہیں۔ دیگر محرکات کا جائزہ لیا جائے تو یہ وجوہات مذہبی،سیاسی،سماجی اور تاریخی نظریات وروایات بھی ہیں۔ پہلے اس حقیقت کو سمجھنا ہوگا کہ اس سماج میں خودکشی بہادری اور غیرت کی علامت کے ساتھ ساتھ گناہوں کا کفارہ سمجھی جاتی ہے۔صدیوں سے یہاں ایک رسم قائم رہی ہے، جسے ''ہارا کیری''،یعنی خنجر سے اپنا پیٹ چاک کرنا کہتے ہیں۔ جب کوئی اہم عہدیدار،معزز اہلکار یا پھر حکومتی ذمہ دار کوئی غلطی کر لیتا تو

عمومی طور پر خود فرمائش کرتا کہ اسے غیرت کے ساتھ مرنے کا موقع دیا جائے اور''ہارا کیری'' کی اجازت دے دی جائے۔ بعض صورتوں میں بادشاہ، سمورائی اور بڑے عہدے دار غلطی کے مرتکب فرد کو تلوار یا خنجر خود پکڑا دیتے تھے، جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ اگر عزت کے ساتھ اپنا پیٹ چاک خود کر لے تو اس کے خاندان کے دیگر افراد کو کوئی ایذا نہیں پہنچائی جائے گی۔ ہارا کیری بذات خود ایک الگ مضمون کا متقاضی موضوع ہے کہ انسانی جسم میں ایک جگہ ایسی ہے کہ اگر پیٹ چاک سے تلوار یا خنجر اس نقطے سے ٹکرائے تو درد کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اور ایک پرسکون موت مقدر میں آتی ہے، مگر اس موضوع پر پھر کبھی بات ہوگی۔

آتما ہتیا کرنے کی ایک وجہ سماج میں خیرات دینے کا عمومی عدم تصور ہے۔ اس لئے معاشی بحران کا شکار شخص اول تو کسی سے مدد مانگتا نہیں ہے، چونکہ پورے ملک میں مدد مانگنے اور خیرات دینے کا کوئی تصور ہی موجود نہیں۔ اگر کوئی اپنی غیرت مار کر مدد مانگ بھی لے تو کوئی بھیک دینے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔ شائد اسی سبب سے پورے ملک میں آپ کو کوئی بھکاری نہیں ملے گا۔ مگر یہ رویہ خودکشی میں اضافے کا سبب بھی ہے کہ جب کوئی مالی بحران کا شکار ہوتا ہے تو اس کی آس بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ اور حالات میں بہتری کی امید بھی مر جاتی ہے۔

پاکستان میں مشکل معاشی حالات کے باوجود خودکشی کرنے کی شرح انتہائی کم ہے، اس خوش قسمتی کی وجہ ایک تو ہمارا مذہب اسلام ہے جو کہ اس عمل کو حرام قرار دیتا ہے۔ ورنہ طرح طرح کے دباؤ، پریشانیاں اور الجھنوں کے سبب خودکشی کرنے والے افراد کی تعداد بہت زیادہ ہوتی۔ دوسری اہم وجہ ہمارا مشترکہ خاندانی نظام ہے۔ جو کہ ہمیں تنہائی کا شکار ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔ اس تنہائی کے تدارک کے لئے جاپان میں تو ایک خصوصی وزارت تشکیل دینا پڑتی ہے اور اربوں روپے اب تک خرچ ہو بھی چکے ہیں۔ تیسری وجہ زندگی میں عدم مقصدیت ہے جو اس ہلاکت خیزی کا سبب بنتی ہے، ہمارے ہاں زندگی کا

مقصد صرف اپنی ذات ہی نہیں ہوتی، بلکہ ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے، اور دیگر دوست احباب کے مسائل بھی ہم لوگ ذاتی مسائل اور مقاصد سمجھتے ہیں، اس لئے پاکستانیوں کی زندگی میں عدم مقصدیت کا رواج اور جگہ نہیں ہے۔ یہاں جو بڑی بڑی رضا کار تنظیمیں ہیلپ لائن قائم کر کے کام کرتی ہیں، ہمارے ہاں ہر آدمی ہی کسی نہ کسی کی ہیلپ لائن ہوتا ہے اور اسے احسان بھی نہیں سمجھتا۔

چین مخالف اتحاد؟

عام طور پر عالمی سطح کے سیاسی، سماجی، معاشی اور عسکری اتحاد ہوں یا پھر تنظیمیں، ان کے نام ایسے نہیں ہوتے جیسا ''دی کواڈ'' ہے۔ چار اہم عالمی طاقتوں امریکہ، آسٹریلیا، جاپان اور ہندوستان پر مشتمل اس ''کواڈ'' کا نام شائد اس لئے بھی کچھ مختلف ہے چونکہ یہ کوئی باقاعدہ اتحاد یا تنظیم نہیں ہے۔ ستم ظریفی مگر ملاحظہ فرمایئے کہ آج ہر اہم بین الاقوامی پلیٹ فارم پر یہی ڈھیلا ڈھالا سا اتحاد گفتگو کا موضوع بنا ہوا ہے۔ عالمی میڈیا میں ان دنوں خبروں کا موضوع بننے کی وجہ ''کواڈ'' کا حالیہ سربراہی اجلاس ہے۔ امریکی صدر جو بائیڈن اور بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کے علاوہ جاپان اور آسٹریلیا کے وزرائے اعظم نے بھی مواصلاتی ویڈیو رابطے کے ذریعے اس اہم اجلاس میں شرکت کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مارچ کے مہینے میں عالمی سیاست، خارجی اور دفاعی اعتبار سے یہ اجلاس سب سے اہم رونما ہونے والا واقعہ تھا تو اس میں ذرا بھی، مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ چین کی حکومت نے اس اجلاس اور تنظیم کو چین مخالف قرار دیتے ہوئے سرد جنگ کے زمانے کی فرسودہ سوچ کا شاخسانہ اور چین کی ترقی کو روکنے کا بہانہ بتایا ہے۔

بحرالکاہل اور بحیرہ ہند کے درمیان آزادانہ آمدورفت کو یقینی بنانے کے نصب العین پر قائم ہونے والے چار ملکی اتحاد میں آخر کوئی تو بات ایسی ہوگی کہ اسے چین مخالف قرار دیا جارہا ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بنتی، بگڑتی اس دنیا میں اور بھی تو اتنا کچھ ہو رہا ہے مگر آخر کار کواڈ کو ہی چین اپنا مخالف کیوں قرار دے رہا ہے؟ بظاہر لفظ ''سکواڈ'' کی آواز ''کواڈ'' سے ملتی ہے جو کہ دفاعی و مسلح

معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔مگر ملتے جلتے صوتی اثرات کی بنیاد پر تو اسے عسکری وتزویراتی منصوبہ قرار نہیں دیا سکتا۔حقیقت حال یہ ہے کہ غیر جانبدار مبصرین اسے ''ایشین نیٹو'' قرار دے رہے ہیں اور موجودہ چینی صدر شی چن پنگ کے ون بیلٹ ون روڈ منصوبے کے مدمقابل پروگرام گردان رہے ہیں۔

آج جب ہر طرف چار کے ٹولے کا چرچا ہے،چین مخالف اتحاد کی اصطلاح فقط چینی میڈیا سے نہیں آرہی بلکہ یہی آواز ہمیں مغربی میڈیا سے بھی کانوں میں مسلسل پڑ رہی ہے،تمام ذرائع ابلاغ کی جانب سے کواڈ کو چین مخالف محاذ کہہ کر بلایا جارہا ہے۔ایسے عالم میں مناسب ہوگا کہ اس فورم کی ابتدااور بنیاد کا تذکرہ کریں۔جس سے بہت سارے سوالات کے جوابات مل سکتے ہیں۔کواڈ بنانے کا خیال جاپان کے سابق وزیراعظم شنزوآبے نے 2004 میں پیش کیا تھا۔یہ 2007 تھا جب اس خیال نے عملی شکل اختیار کر لی،اسی برس پہلی بار ایشیاء پیسفک اجلاس کی راہداریوں میں مذکورہ چار ممالک کے سربراہان مل بیٹھے تھے اور یہ اتحاد تشکیل پایا تھا۔سچی بات تو یہ ہے کہ کہ اس فورم کا بنیادی مقصد ہی چین کی معاشی ترقی اور بڑھتے ہوئے تزویراتی اثرات کے آگے بند باندھنا ہے۔FOIP کے نام سے فری اینڈ اوپن انڈو پیسفک وژن کا یہ ادارہ بظاہر خطے میں امن اور استحکام کے لئے تشکیل دیا گیا ہے مگر جب ہندوستان کے وزیراعظم نریندر مودی حالیہ ورچوئل اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ''کواڈ کی روح'' کا ذکر کرتے ہیں تو وہ صاف ظاہر ہے کہ انڈو پیسفک کے علاقے میں چین کے اثرات کو محدود تر کرنے کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

قیام تو اس تنظیم کا 2007 میں ہوا مگر سالہا سال کی گہری نیند کے بعد بیداری 2017 میں ہوئی۔وہ بھی یوں کہ رنگا رنگ سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ چین کو ہر محاذ پر ٹکر دینا چاہتے تھے۔جو بائیڈن کے ویسے تو موصوف سے ایک سو ایک اختلاف رہے ہوں گے مگر اس موضوع پر انہوں نے ڈونلڈ ٹرمپ کی خارجہ پالیسی کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔بھارت میں کرونا ویکسین کی تیاری اور عالمی سطح پر اس کی ترسیل کے متعلق تمام معاملات اسی کواڈ کے پلیٹ فارم پر طے پائے ہیں۔بالفاظ دیگر ہندوستان کی موجودہ عالمی حیثیت کے پیچھے ''کواڈ'' کا بہت اہم کردار ہے۔یہاں ایک بات کا تذکرہ میں ضرور کرنا چاہوں گا،من حیث القوم ہمیں یہ بات ذہن نشین

کرنے کی ضرورت ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں آزاد ممالک کے باہمی خارجہ تعلقات ویسے نہیں ہوتے جیسے افراد کے ذاتی تعلقات ہوتے ہیں۔انسانوں کے باہمی تعلقات میں دوستی کا رشتہ قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔جو آدمی دوست کی دلجوئی،آسانی اور خوشی کے لئے اپنا چھوٹا سا بھی مفاد قربان نہیں کرسکتا وہ شخص دوستی کے قابل نہیں ہوتا۔عالمی سیاسی منظرنامے پر نظر ڈالیں تو ہمیں صورتحال یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ہر ملک اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے سرگرم عمل نظر آتا ہے۔طاقتور عالمی قوتوں کا نہ کوئی ملک مستقل دوست ہے اور نہ ہی کوئی دیس مستقل دشمن رہتا ہے۔مشترکہ مفادات اور مشترکہ دشمن ممالک کو قریب لے کر آتے ہیں اور دوری کا سبب بھی بنتے ہیں۔ورنہ حالیہ برسوں میں ہم نے اپنے وزیراعظم کو عرب ملکوں کے حکمرانوں کی ڈرائیوری کرتے ہوئے دیکھا ہے،جو کہ بالکل ہی بے سود اور بے ثمر رہی۔

چین کے ساتھ پاکستان کی دوستی کی بڑی ٹھوس وجوہات ہیں۔پہلی وجہ جغرافیہ،دوسری وجہ مشترکہ دشمن بھارت اور تیسری وجہ سرحد کے ساتھ سنکیانگ کی غیور مسلمان آبادی وہ مشترکہ دلچسپی کا موضوع ہیں جو ہمیں اچھے ہمسایہ تعلقات کی جانب لے جانے کا سبب ہے۔بلا شبہ معاشی پہلو ہمارے دوطرفہ تعلقات میں سب سے اہم ہے۔یہ معیشت ہی ہے جو امریکہ اور چین کی باہمی مخاصمت کے باوجود انہیں مجبور رکھتی ہے کہ اپنے خارجہ دوطرفہ تعلقات کو ایک خاص حد سے زیادہ خراب نہ ہونے دیں چونکہ 2020 میں امریکہ کا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار چین ہی رہا ہے۔یہ الگ بات کہ امریکیوں کے ساتھ حالیہ ملاقات کے بعد چینی حکومت نے یہ بیان جاری کیا ہے کہ امریکہ اور اس کے حلیف سرد جنگ کے زمانے والی ذہنیت رکھتے ہیں اور چین بیرونی طاقتوں کے مقابلے میں تیار کھڑا ہے۔

کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے مگر حقیقت یہی ہے کہ چین کے معاشی ابھار سے تمام دنیا اور بالخصوص مغربی دنیا نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ایک سادہ سی مثال دوں کہ جاپان میں آج سے تیس سال پہلے جو شیشے کا گلاس ہزار روپے سے کم قیمت پر کہیں بھی دستیاب نہیں تھا،آج وہی گلاس سو روپے میں ہر شہر اور ہر قریے میں با آسانی دستیاب ہے۔اس کی واحد وجہ ''میڈ ان چائنا'' مال کا مارکیٹ میں آنا ہے۔

چین کے سبب سے تمام دنیا میں اکثر اشیاء جو روزمرہ کے استعمال کی تھی مگر صرف امیروں کی ہی قوت خرید میں آتی تھیں، چین نے وہ عام انسانی ضرورت کی اشیاء سستے داموں ہر آدمی کی دسترس میں کردی ہیں۔ میری نظر میں چین کے انقلاب اور معاشی ترقی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے ستر کروڑ انسانوں کو غربت کی دلدل سے باہر نکالا ہے۔ آپ یہ سوچیں کہ اگر کوئی بھی نظام اور ریاست دنیا کے پندرہ فیصد لوگوں کو غریبی کے عذاب سے نجات دلا دیتی ہے تو یہ نا صرف انقلاب بلکہ کرشمہ ہے اس معاشی معجزے کے لئے کمیونسٹ پارٹی اور عوامی جمہوریہ چین کی جتنی زیادہ بھی تعریف کی جائے وہ کم ہی ہے۔

مذکورہ کواڈ اتحاد میں شامل ہندوستان کی ترجیح بحیرہ ہند میں چین کی کاروائیوں کو محدود کرنا اور اس کے اثرات کو کم کرنا ہے۔ ستم ظریفی مگر یہ ہے کہ آسٹریلیا، بھارت اور جاپان کا معاشی انحصار چین پر بہت زیادہ ہے۔ چین جاپان کا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار ہے۔ آسٹریلیا کی درآمدات اور برآمدات دونوں شعبوں میں چین پہلے نمبر پر ہے۔ اور بھارت کا بھی سب سے بڑا تجارتی ساجھے دار چین ہی ہے۔

محنت میں عظمت ہے

ایک جاپانی بوڑھا دوپہر کے وقت میرے ایک دوست کے پاس آیا۔عمر رسیدہ مگر صاف ستھرا،کلین شیوڈ۔میرا مذکورہ دوست ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک ہے۔شوروم پر کھڑی گاڑیوں پر طائرانہ نظر ڈالنے اور ایک دو گاڑیوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد وہ دفتر کے اندر بیٹھے میرے نیپالی دوست سے کہنے لگا کہ مجھے ایک پرانا ٹرک چاہئے،جس کے پیچھے کوئی ڈبہ لگا ہو۔ٹرک مگر زیادہ بڑا نہ ہو اور زیادہ مہنگا بھی نہیں ہونا چاہئے۔ عام طور پر ہمارے غیر ملکی کارڈیلر جاپانی گاہک دیکھ کر خوش ہوجاتے ہیں،چونکہ اگر یہ گاڑی خریدیں تو عمومی قیمت سے قدرے مہنگی خرید لیتے ہیں،اور جب بیچنا چاہیں تو انتہائی سستی بیچ جاتے ہیں۔مستقبل کی اسی روشن امید کے ساتھ میرے دوست نے بڑی گرمجوشی سے بوڑھے جاپانی کا استقبال کیا۔

گاہک کی فرمائش پوچھنا تو ہمارے کاروبار کا اولین زینہ ہوتا ہے۔عموماً لوگ اپنے ذہن میں مطلوبہ گاڑی کا نقشہ لے کر ہی کسی شوروم میں داخل ہوتے ہیں۔متذکرہ بڈھا مگر اس معاملے میں بہت نرم موقف کا حامل تھا۔جب پوچھا گیا کہ کون سے میکر کا ٹرک ہونا چاہئیے؟ٹویوٹا،نسان،ڈائی ہاتسو، ہنڈا،مٹسوبشی،مزدا یا پھر کوئی اور؟ جاپانی بزرگ کا جواب تھا کوئی بھی ہو، چلے گا۔آٹومیٹک گئیر اور مینول گئیر کا فرق بھی اہم سمجھا جاتا ہے،لیکن اس نے اس بابت کی بھی کوئی مخصوص شرط نہیں لگائی بلکہ ڈیزل اور پٹرول کا فرق بھی اس کی شرائط کا حصہ نہ تھا۔چھوٹے ٹرک کا باکس عموماً دو طرح کا ہوتا ہے۔ایک فریزر والا دوسرا سادہ۔

اس باکس کی تفصیل کے متعلق جاپانی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ دونوں میں سے کوئی بھی جو آسانی سے آپ کو مل جائے، چلے گا۔ میرے دوست نے مزید کرید کر پوچھا کہ اگر ٹرک کے پیچھے المونیم کے باکس کی بجائے ترپال کا باکس لگا ہو تو پھر بھی آپ خرید لیں گے؟ بڈھے کا جواب تھا کہ اگر وہ ذرا استعمال جائے تو وہ بھی میں خرید سکتا ہوں۔ عمومی طور پر گاڑی خریدنے والے حضرات اپنی پسند کے بارے میں اتنے ڈھیلے ڈھالے نہیں ہوتے۔ شائد اسی سبب سے میرے دوست نے ذرا بے تکلفی اور اپنائیت سے گاہک کو کافی پلا کر پوچھ لیا کہ بابا جی آپ کو ٹرک چاہیے کس مقصد کے لئے؟ آپ نے اس کا کرنا کیا ہے؟

اس سوال پر بوڑھے جاپانی نے قدرے راز داری کے انداز میں جواب دیا کہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس کا کچھ بھی نہیں کرنا۔ کسی بھی کام کے لئے نہیں ہے۔ خواہش بس یہی ہے کہ جب میں صبح اپنے گھر کی پارکنگ سے ٹرک لے کر نکلوں تو میرے محلے دار یہ سمجھیں کہ میں کام پر جا رہا ہوں۔ جب ٹرک واپس لے کر آتا دیکھیں تو اہل محلّہ کا گمان یہ ہو کہ میں کام سے واپس آ رہا ہوں۔ یہ کوئی نہ سوچے کہ میں اب کسی کام کا نہیں رہا۔ بس فارغ بیٹھا روٹیاں توڑ رہا ہوں۔

یہ سچا واقعہ بیان کرنے کا مقصد اس بڑی حقیقت کی طرف آپ کی توجہ دلانا ہے کہ قومیں بلا وجہ ترقی نہیں کرتی ہیں۔ عظیم قومیں کام کرنے والوں کی عظمت تسلیم کرتی ہیں۔ سماج کا رویہ یہی ہے کہ جو محنت مشقت کرتا ہے گلی محلے میں اسی کی عزت ہوتی ہے۔

حکومت سے اچھے ترقیاتی کاموں اور کارِ خیر کی توقع رکھنا عوام کا حق ہوتا ہے۔ چاہے وہ تحریک انصاف کی موجودہ حکومت ہی کیوں نہ ہو۔ سرکار سے کرشمہ گری کی امید کرنا بھی برا نہیں ہے۔ کچھ کام اور ذمہ داریاں مگر سماج اور معاشرے کی بھی ہوتی ہیں۔ تمام تر اقدامات جو ملکوں کو ترقی اور عظمت کے راستے پر لے جاتے ہیں۔ ریاستی سطح پر کرنے کے نہیں ہوتے ہیں۔ کام کو عزت دینا ہم عوام کا کام ہے۔ محنت کرنے والے محنت کش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے، یہ بھی سماج کی ذمہ داری ہے ۔موچی صاحب ،دھوبی صاحب ،نائی صاحب، مکینک صاحب ،الیکٹریشن صاحب، خاکروب صاحب ، سننے میں آپ کو شائد عجیب لگے، مگر جاپان میں کسی بھی پیشے سے منسلک آدمی کو اسی طرح بلایا جاتا ہے۔ اگر صاحب کا لاحقہ ہٹا کر کسی کو بلائیں گے تو یہ انتہائی

بدتمیزی اور بدتہذیبی شمار ہوگی۔ مزید یہ نہیں کہ جب اس کو مخاطب کرنا ہے تو ترکھان صاحب، لوہار صاحب، مچھیرا صاحب کہنا ہے، بلکہ غیر موجودگی میں بھی کسی پیشے سے منسلک شخص کا نام اس کے ساتھ صاحب لگا کر ہی لیا جاتا ہے۔ یہ کوئی حکومت کا نافذ کردہ قانون نہیں ہے، سماج کا اپنایا گیا رویہ ہے۔ یہ سماج کا رویہ ہے کہ اگر کوئی کہے کہ میں وزیر ہوں یا وزیر اعظم کا بیٹا ہوں تو آگے سے جواب ملے گا اچھا جی!! اور اگر آپ کہیں کہ میں جولاہا ہوں یا پھر چپڑاسی کا بیٹا ہوں، تو بھی وہی جواب ملے گا اچھا جی!! اور اس جواب کے کہے گئے ''اچھا جی!!'' میں لہجے تک کا فرق محسوس کرنا مشکل ہوگا۔ بے روزگاری الگ چیز ہے، اگر کسی شخص کے بارے میں یہ پتہ چل جائے کہ یہ کام چور ہے، یا پھر یہ فارغ ہی رہتا ہے تو یقین کیجئے جاپان کے معاشرے میں ایسے شخص کو کوئی منہ نہیں لگائے گا۔ اس کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ دوست احباب ایسے شخص کو ملنے تک سے کترائیں گے۔

حصّہ سوم

جو بچا ہے مقتلِ شہر میں

منّو بھائی۔۔۔وہ مرد قلندر چھوڑ گیا

منو بھائی سے جب کوئی ان کا سن پیدائش پوچھتا تو اکثر مذاقاً ہٹلر کے جرمنی میں بر اسراقتدار آنے کے واقعے کے ساتھ ملا کر 1933ء بتایا کرتے تھے۔عہد ساز صحافی، نامور پنجابی شاعر،مقبول ڈرامہ نگار اور بائیں بازو کے اس عظیم دانشور کی موت کا دکھ اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ اب اس جیسا کوئی دوسرا نظر نہیں آرہا۔جس منیر احمد قریشی کا نام احمد ندیم قاسمی نے منو بھائی رکھا تھا وہ چھ دہائیاں صحافت میں بھرپور طریقے سے سرگرم عمل رہے،مگر ان کے بدترین دشمن بھی ان کی دیانت کی گواہی دیتے تھے۔نظریاتی مخالفین بھی اس اصول پرست شخصیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ طویل صحافتی کیئریئر میں انہوں نے کبھی اپنے نظریات کی قیمت وصول نہیں کی۔قلم کی حرمت کو پامال نہیں ہونے دیا۔تمام زندگی منو بھائی نے اپنے قلم کو غریبوں کے حقوق اور کمزوروں کی حمایت کے لیے استعمال کیا۔بے کسوں،مسکینوں اور لاچارونادار لوگوں سے ان کو خصوصی محبت تھی۔تمام زندگی اس مجبور و محکوم طبقے کے لیے وہ قلمی جہاد کرتے رہے۔چھ فروری 1933ء کو وزیر آباد میں اسٹیشن ماسٹر کے ہاں پیدا ہونے والے اس شخص کی وفات کے ساتھ ہی اردو صحافت کا ایک درخشاں عہد اپنے اختتام کو پہنچا۔

میری خوش قسمتی ہے کہ میرا ان کے ساتھ کافی وقت گزرا۔ان کے ساتھ عقیدت مندی کا سلسلہ زمانہ طالب علمی سے شروع ہو گیا تھا۔اسی نیاز مندی کا اظہار ہم دوستوں نے ’’منو بھائی فین کلب‘‘ کے قیام کی صورت میں کیا،اس کا نام انہوں نے خود تبدیل کر کے ’’منو بھائی فرینڈز کلب

’’رکھ دیا۔متعدد بار میری دعوت پر میاں چنوں تشریف لائے اور مشاعروں میں شرکت بھی کرتے رہے ۔ میرے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ میں نے منو بھائی پر بہت سارا تخلیقی کام کیا ہے۔سوشلسٹ ہونے کے سبب انہیں معیشت اور سرمائے کی منصفانہ تقسیم کے موضوع سے خصوصی دلچسپی تھی۔ میں نے ان کے معیشت کے موضوع پر تحریر کردہ کالمز اور مضامین کو ان کی نگرانی میں اکٹھا کیا۔مرزا غالب کے مصرعے ’’باغ سے بازار تک‘‘ کے نام سے یہ کتابی شکل میں یکجا ہوئے۔جب میں نے ان کے اخباری کالمز کا انتخاب اوران پر تحقیق و ترتیب کا کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو کہنے لگے! پہلے قیصر زیدی نے یہ کام شروع کیا تھا۔مگراس نوجوان صحافی کی اچانک رحلت کی وجہ سے یہ کام رک گیا تھا۔ پھرایک طالب علم نے دوبارہ یہ ترتیب و تحقیق کا کام شروع کیا اور وہ بھی بدقسمتی سے وفات پا گیا۔اب میں کسی تیسرے نوجوان کی جان نہیں لینا چاہتا ہوں۔ یہ خیران کی بزلہ سنجی اور شگفتہ طبیعت کا حصہ تھا، میں ذرا سخت جان ثابت ہوا اور معاشی کالمز ’’باغ سے بازار تک‘‘ کی صورت میں جمع ہو گئے۔

منو بھائی ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ بہت حساس، ہمدرد اور محبت بھرے آدمی تھے۔مرنے والوں کی یاد میں ان کے تحریر کردہ کالمز ’’جنگل اداس ہے‘‘ کے نام سے شائع ہوئے جو کہ ادب کا شاہکار ہیں۔ مجھ سے بہرحال انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اس کتاب کا نام تبدیل کرنا چاہتے ہیں، ان کے بقول یہ اے۔حمید کے کسی ناول کا نام بھی شاید پہلے سے تھا۔ پنجابی شاعری کی کتاب ’’اجے قیامت نئیں آئی‘‘ کے نام سے چند سال پہلے شائع ہوئی جس میں صرف نظمیں ہی ہیں۔ میں نے اس متعلق ان سے استفسار کیا تو کہنے لگے کہ غزل اردو زبان میں زیادہ ارتقاء پذیر ہو چکی ہے اور نظم ارتقائی اعتبار سے پنجابی میں زیادہ آگے ہے۔اس لیے میں نے نظم کی صنف کو ہی چنا ہے۔ڈرامہ نگاری کی بات کریں تو ’’سونا چاندی‘‘ ایسا شاہکار ہے جو کہ ہمیشہ پاکستانی ڈرامے کی تاریخ کے ماتھے کا جھومر رہے گا۔

منو بھائی کے ڈرامے کے کردار عام زندگی کے عوامی کردار ہوتے تھے۔ ہندوستانی ڈراموں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ یہ کس طرح کے کردار ہیں؟ ارب پتی بیگم صاحبہ، گھر میں سونے کے زیورات سے لدی، پھندی بیٹھی ہیں مگر اسی گھر میں ڈرائیور کا کوئی کردار نہیں اور بیگمات

گاڑی خود چلاتی ہیں۔نو سو کروڑ کے کاروبار کی بات ہو رہی ہے اور گھر میں باورچی نظر نہیں آ رہا، یہ کس طرح کا ڈرامہ ہے؟ آخری عمر میں انہوں نے ڈرامے لکھنا ترک کر دیا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ یار اب میں کوکا کولا اور نیسلے کے لیے تو ڈرامہ نہیں لکھ سکتا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج پاکستان میں ملٹی نیشنل کمپنیاں ٹی دے ڈراموں کا مواد بھی ڈکٹیٹ کرواتی ہیں۔

جمہوریت میں ان کا کامل ایمان تھا۔ضیاءالحق کے آمرانہ دور میں بڑے مشکل حالات سے گزرے مگر کلمہ حق بلند کرتے رہے۔ بھٹو خاندان کے ساتھ ان کی خصوصی محبت تھی، اس کی وجہ شخصی نہیں نظریاتی تھی، کیونکہ بھٹو صاحب نے پیپلز پارٹی کا جو بنیادی منشور پیش کیا، اس کے مطابق انہوں نے ''سوشلزم ہماری معیشت ہے کا نعرہ دیا تھا''۔منو بھائی راسخ العقیدہ سوشلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ سیدھے، سادھے مسلمان بھی تھے۔ وہ شکوہ کرتے تھے کہ روس کے کیمونسٹوں نے مذہب کو ہدف تنقید بنا کر برا کیا تھا، کیمونزم تو ایک خالصتاً معاشی موضوع ہے، پھر مذہب کے خلاف بکواس کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ وہ ایک ترقی یافتہ اور جدید پاکستان چاہتے تھے جہاں عدالتی انصاف کے علاوہ معاشی انصاف بھی موجود ہو۔ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے، حالات چاہے جتنے بھی مشکل کیوں نہ ہوں۔ پہاڑ جیسا حوصلہ چاہیے ایسی مسکراہٹ برقرار رکھنے کے لیے۔ اور پھر مسکراہٹیں بکھیرنے کی کوشش بھی کرتے۔ بیمار بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے۔سندس فاؤنڈیشن کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی تھی۔ تھیلیسمیا کے مریض بچوں کی وہ ہمیشہ خصوصی دلچسپی لے کر مدد کرتے اور تمام دوست احباب کو بھی مدد کرنے پر ابھارتے تھے۔ عمران خان کی دعوت پر اکثر شوکت خانم ہسپتال جاتے اور کینسر کے مریض بچوں کے لیے کتابوں کا تحفہ ساتھ لے جاتے۔ان بچوں کے پاس بیٹھ کر انہیں کہانیاں سناتے تھے۔میری عمران خان سے پہلی ملاقات بھی منو بھائی کی بیٹی کی شادی میں ہی ہوئی تھی۔ مجھے یہاں ایک گواہی بھی دینی ہے۔ پرویز مشرف جب پاکستان کے صدر تھے تو وہ شوکت خانم ہسپتال آئے تھے۔میری موجودگی میں عمران خان کا منو بھائی کو ٹیلی فون آیا اور انہوں نے پرویز مشرف کے لیے تقریر لکھنے کی فرمائش کی جو کہ صدر مشرف نے لاہور کے کینسر ہسپتال میں فرمانا تھی، منو بھائی نے صاف انکار کر دیا۔فون بند کرنے کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے کیا پتا اس پاگل آدمی نے کیا بات کرنی ہے؟

منو بھائی کے اردگرد بہت سے صحافی اور ان سے کئی جونیئر قلم کار حکمرانوں سے مفادات اُٹھا کر ارب پتی بن گئے مگر انہوں نے کبھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا چاہے اس کی قیمت انہیں جو بھی چکا نا پڑی، ریواز گارڈن لاہور کے جس گھر سے ان کا جنازہ اٹھایا گیا، اس مکان کے باہر انہیں پلستر کروانے کے لیے بیس سال کا عرصہ انتظار کرنا پڑا۔ اس رہائش گاہ کے علاوہ انہوں نے چھ دہائیوں پر محیط اپنے فنی کیریئر میں کوئی جائیداد نہیں خریدی۔ ایک دن دورانِ گفتگو کہنے لگے کہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ کتابوں میں سے لفظ اٹھا لیے جائیں گے۔ منو بھائی کہنے لگے کہ اس سے مراد لفظوں کی تاثیر ہے، الفاظ غیر موثر ہو جائیں گے، ان کا اثر ختم ہو جائے گا۔ وہ خوش قسمت رہے کہ مالک کائنات نے تا مرگ ان کی تحریر کی تاثیر برقرار رکھی۔ ان کے لکھے ہوئے لفظ تا دمِ آخر پر تاثیر رہے۔ منو بھائی پاکستانی صحافت کا ضمیر اور ادب کی شان تھے۔ دل مانتا ہی نہیں کہ وہ مردِ قلندر دنیا چھوڑ گیا۔ لگتا ہے ہمارے منو بھائی جو کہ جذباتی بھی بہت واقع ہوئے ہیں ہم سے ذرا سا روٹھ گئے ہیں، مان جائیں گے، پھر واپس آ جائیں گے۔

مشکور حسین یادؔ کی یادیں

زندگی تھوڑی سی بچی ہے، اس لیے زیادہ سے زیادہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آخری ملاقات میں یہ الفاظ تھے سید مشکور حسین یادؔ کے جو گزشتہ روز لاہور میں انتقال فرما گئے۔ نامور شاعر، خوبصورت ادیب اور منجھے ہوئے اس صحافی نے 92 سال کی طویل عمر پائی۔ خدا کی رحمت سے آخری وقت تک چاک و چوبند اور تخلیقی کام میں مشغول رہے۔ وہ اردو شعر و ادب کا ایک ناقابل فراموش حوالہ ہیں۔ ساٹھ سے زائد کتابوں کے مصنف، اپنی تمام زندگی حرفوں کی تخلیق اور تدریس میں گزار گئے۔ صحافت سے ان کی وابستگی بہت پرانی تھی، جب پاکستان بنا تو 1947 میں بھی ایک سرکاری اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ ربع صدی گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھایا، جہاں سے ان کے ہزاروں شاگرد ہر شعبہ زندگی میں گئے۔ ان کے شاگردوں میں سابق وزیراعظم میاں محمد نواز شریف سمیت بہت سے وزراء، افسران اور اہم حکومتی و غیر حکومتی افراد شامل ہیں۔ عجب اتفاق ہے کہ مشکور حسین یادؔ کی زندگی کا آخری انٹرویو میں نے اور میرے ہم جماعت شاعر دوست عنبر عباس زیدی نے کیا تھا۔ سمن آباد کے علاقے ظفر کالونی میں ان کی رہائش گاہ پر خوب مزے کی طویل گپ شپ ہوئی۔ ہنسی، مذاق اور چٹکلے ان کی شخصیت کا ایک خوبصورت پہلو تھا۔

ابتدائی زندگی کے بارے میں بتاتے تھے کہ میرے والد صاحب پولیس میں تھے۔ یہ 1925ء کی بات ہے، جب ان کی تعیناتی ضلع حصار (مشرقی پنجاب) کے علاقے بھٹنڈا میں تھی تو وہیں موضع منڈی ڈوالی میں میری پیدائش ہوئی، ابتدائی تعلیم والد صاحب کی نوکری کے ساتھ چلی

۔سکول میں داخلہ دوسری جماعت میں لیا تھا۔اس کے بعد سکول تبدیل ہوتے رہے مگر سب کے سب سرکاری سکول ہی تھے۔میرے نانا اچھے خاصے ادیب اور توانا شاعر تھے۔میرے خیال میں شاید ننھیال کی طرف سے شعروسخن سے رغبت مجھ میں آئی ہے۔مگر میرے دادا بھی لکھنے، پڑھنے سے متعلق آدمی تھے اور دادی تو لکھنؤ کی مشہور شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ پھینکا بیگم کے نام سے لوگ انہیں خوب پہچانتے تھے۔اس لحاظ سے میرا تعلق لکھنؤ سے بھی بنتا ہے۔ویسے میرے خاندان کا تعلق ضلع مظفرنگر کے قریب بڈاولی گاؤں سے ہے۔اس گاؤں کے علاوہ بھی ہمارے پاس تیس گاؤں تھے جو نواب صاحب نے دیے تھے۔ہم اچھے خاصے جاگیردار تھے۔میں آٹھویں جماعت میں تھا جب ضلع حصار میں واقع ہمارے سکول میں ترانہ پاکستان کے خالق حفیظ جالندھری تشریف لائے۔ انہوں نے مجھ سے غزل سنی اور داد دیتے ہوئے کہا کہ تم تو بہت زوردار شاعر ہو۔

اپنی پہلی کتاب کی اشاعت کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ وہ شاعری کی تھی،نثر کا سلسلہ بعد میں شروع ہوا۔ایک درجن شعری مجموعوں کے خالق سید مشکور حسین یادؔ کو اردو انشائیے کا موجد اور بانی کہا جاتا ہے۔میں نے آخری ملاقات میں جب ان سے پوچھا کہ تدریس کا تجربہ کیسا رہا؟اس پر ان کا کہنا تھا کہ ذہین طلباء استاد کو پڑھانا سکھاتے ہیں۔میں نے پچیس سال گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھایا اور ایک بھی ناغہ نہیں کیا،کوئی ایک کلاس بھی مس نہیں کی۔یہ جو آجکل کہتے ہیں کہ شاگرد اپنے اساتذہ کی عزت نہیں کرتے، یہ بالکل غلط اور فضول بات ہے،استاد اپنے فرض کو نبھا کر تو دیکھے،شاگرد اب بھی عزت کرنے والے ہیں۔عشق کی بابت میرے سوال پر ان کا کہنا تھا کہ بھائی !جس نے عشق نہیں کیا وہ تو بالکل گدھا ہے۔ہم نے تو زندگی میں بہت سے عشق کیے ہیں۔عشق کے بغیر تو انسان مکمل ہی نہیں ہوسکتا۔میں تو ہمیشہ ہی عشق کے لیے تیار ہوں۔ان سے جب بھی میں نے ان کی گھنی زلفوں اور چستی کا راز پوچھا ٹال گئے۔ایک دن ترنگ میں تھے، گھنے بالوں پر سوال کیا تو کہنے لگے، دراصل میرے ابا گنجے تھے، دادا بھی گنجے تھے، نانا بھی گنجے، حتیٰ کہ میری دادی اماں بھی گنجی تھیں۔جوانی کے دنوں میں جب میں بال بناتا تو اماں طنز کرتیں کہ بیٹا یہ چند دن کے مہمان ہیں۔پھر نہیں رہیں گے۔میں نے دیکھا ہے کہ آپ اپنے بارے میں جیسا گمان کرتے ہیں ویسا ہی ہوجاتا ہے۔

گزشتہ صدی کی صحافت ہو یا پھر شعر وسخن، انجمن ترقی پسند مصنفین کے تذکرے کے بغیر مکمل تاریخ نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس متعلق ان کا کہنا تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے تمام سرکردہ لوگ میرے دوستوں میں شامل تھے، مگر کبھی اس تحریک کا باقاعدہ حصہ نہیں بنا۔ سچ بتاؤں تو ہم خود بڑے ''پاٹے خان'' تھے ان دنوں میں قیام پاکستان سے قبل ادبی منظر نامے پر نمایاں لوگوں میں مجھے جگر مرادآبادی زیادہ پسند تھے۔ باقی سب ادباء سے بھی ذاتی تعلق یوں تھا کہ میں نے اورینٹل کالج لاہور سے فارسی اور اردو زبان میں ایم فل کیا جہاں یہ سب لوگ آتے جاتے تھے۔ پارٹیشن کی یادیں البتہ یادؔ صاحب کی بہت پر درد تھیں۔ اپنے 35 اہل خانہ میں سے وہ واحد شخص تھے جو زندہ بچ کر پاکستان پہنچے تھے۔ بتاتے تھے کہ ضلع حصار سے جب ہم نکلے تو میری ماں، بہن، بھائی، نانا، نانی سب مارے گئے۔ میں ان دنوں حصار میں ایک اخبار ''پکار'' کا ایڈیٹر تھا۔ ہمارا گھر ریلوے اسٹیشن کے پاس تھا۔ بڑا اچھا علاقہ تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ محفوظ ہے۔ مگر بلوائی وہاں بھی پہنچ گئے۔ جب بلوائی حملہ آور ہوئے تو میں زمین پر گر پڑا تھا، ٹھوکر لگی تھی۔ وہ سمجھے کہ میں مر گیا ہوں۔ سب اہل خانہ کو قتل کرنے کے بعد انہوں نے تسلی کے لیے دوبارہ نیزے اور برچھیاں ماریں۔ اتفاق سے جب انہوں نے میرے نیزہ مارا تو وہ زمین میں پیوست ہو گیا۔ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے، پھر میں گرتا پڑتا لاہور پہنچ گیا۔

ممبئی بھی مشکور حسین یادؔ کا آنا جانا رہتا تھا۔ میں نے پوچھا جناب سنا ہے کہ ایشوریا رائے آپ سے بے حد متاثر ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں! ہاں! ممبئی میں ان سے ملاقات ہوئی

تھی ۔ پڑھنے لکھنے کی شوقین ہے۔مگر ایشوریا رائے کو چھوڑو، ممبئ میں ہی میری گاندھی جی سے بھی ملاقات ہوئی تھی ۔میں سروجنی نائیڈو کے ساتھ تھا۔گاندی جی گورے چٹے آدمی تھے اورلڑکیوں میں گرے ہوئے تھے۔میں نے سروجنی نائیڈو سے پوچھا کہ اس آتما کومہاتما بنانے میں ان لڑکیوں کا کتنا حصہ ہے؟اب اس طرح کی باتیں زندگی میں ان کانوں کوسننا کبھی بھی نصیب نہ ہوں گیں ۔مشکور حسین یادؔ ہی نہیں رہے،اوران جیسا کوئی دوسراتو ہے ہی نہیں۔

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

میجر منصور خان کی شہادت

عید کا دن خوشی کا تہوار ہوتا ہے۔مگر اس بار عید غم میں لپٹی ہوئی آئی۔ پاڑہ چنار، کوئٹہ اور احمد پور شرقیہ کے سانحات کی وجہ سے ملک بھر میں فضا سوگوار سی تھی۔عید کے دن دل افسردہ سا تھا۔رسم دنیا نبھانے کے لئے ایک سکول کے ہم جماعت دوست کو عید کی مبارک باد دینے کے لئے فون کیا،مبارکبادوں کے تبادلے کے بعد میرے دوست نے استفسار کیا کہ اپنے منصور کا پتہ چلا؟ میں نے کہا کیا مطلب؟ بتانے لگا کہ ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے کہ وہ شہید ہو گیا ہے۔ایک لمحے کے لئے تو مجھے اپنی سماعت پر اعتبار ہی نہیں آیا۔بھلا کیسے ممکن ہے کہ زندگی سے بھرپور ایسا خوبصورت اورتوانا فوجی جوان یوں اچانک یہ عالمِ رنگ و بو چھوڑ جائے۔مگر راوی معتبر اور مشترکہ دوست تھا،شک کی گنجائش نہ تھی۔ بتانے لگا کہ بلوچستان میں ایک دہشت گردی کے واقعے میں ہمارا ہم جماعت اور دوست میجر منصور خان جامِ شہادت نوش کر گیا ہے۔قومی سلامتی کا معاملہ ہونے کے سبب تفصیلات بیان کرنا شاید مناسب نہیں ہوگا۔عید کے دن اسے قومی اعزاز کے ساتھ لاہور میں دفن کیا گیا۔

یادوں اور باتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ذہن میں گردش کر رہا ہے،مگر سب سے بڑھ کر اداس کر دینے والا خیال میجر منصور کی ماں کا ہے۔منصور کی والدہ شعروادب سے بڑا لگاؤ رکھتی ہیں۔کسی زمانے میں ان کے پاس ایک بیاض ہوتی تھی۔ان کا تعلق ایک علمی وادبی گھرانے سے ہے۔چالیس سالہ نوجوان بیٹے کی شہادت پر ان کے کیا جذبات ہوں گے؟ جس بیٹے کو وہ پیا

رسے ''شانی'' کہتی تھیں۔سب سے بڑا بیٹا۔

کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں سے
اسی لئے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

پانچویں جماعت کے امتحانات کے دوران منصور سے پہلی ملاقات یوں ہوئی کہ ہمارا امتحانی مرکز ایک تھا۔حسنِ اتفاق سے ہم چھٹی کلاس میں ایک ہی جماعت میں اکٹھے ہو گئے۔سکول سے شروع ہونے والی یہ دوستی ہمیشہ قائم رہی۔

منصور اور اس کے بہن بھائی بڑی کلاسز میں جانے لگے تو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ان کی فیملی میاں چنوں سے لاہور شفٹ ہوگئی۔ہمارے شہر میں ان کا شمار خوشحال اور تعلیم یافتہ گھرانوں میں ہوتا تھا۔سکول مکمل کرنے کے بعد جب میں بھی لاہور منتقل ہوا تو ہماری پھر سے ملاقاتیں بحال ہوگئیں۔پھر اسے فوج میں کمیشن مل گیا، جسے وہ ہمیشہ ایک اعزاز سمجھتا تھا۔ایک بار میں نے اس سے فوج میں بھرتی ہونے کا سبب پوچھا تھا۔کہنے لگا کہ یار! پیسے تو ساری دنیا ہی کماتی ہے، میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس قوم اور دھرتی کی خدمت کی جائے جس کے ہم پر ان گنت احسانات ہیں۔شاید یہی وہ سوچ اور طرزِ فکر تھا جس کے سبب اس نے اپنی شریک حیات کا انتخاب بھی پاک فوج میں خدمات سرانجام دینے والی ایک خاتون کا کیا۔میجر منصور خان کی بیوی بھی فوج میں میجر ہے، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کی پرورش اب اسی اکیلی خاتون کے کندھوں پر ہے۔دفاع وطن کی راہ پر درپیش خطرات کا میرے شہید دوست کو بڑی اچھی طرح اندازہ تھا مگر صاف دل کا یہ صاف گو سپاہی دلیر بہت تھا۔خوف اس کی چمڑی میں شائد کبھی داخل ہی نہیں ہوا تھا۔وہ ایک اچھا مسلمان اور پکا پاکستانی تھا۔اللہ کے ان نیک بندوں میں سے تھا جن کا مطلوب شہادت ہوتا ہے، جنہیں مومن کہا جاتا ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

پاکستان میں دہشتگردی کے ناسور کو ختم کرنے کے لئے میجر منصور خان نے جو شہادت دی

ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس پاک سرزمین پر امن قائم کرنے میں مددگار اور فیصلہ کن ثابت ہوجائے۔ دہشتگردی کے خلاف جنگ میں میجر منصور خان اور میجر اظہر حسین جو میرے ہم مکتب تھے، ان سمیت جتنے بھی گمنام سپاہی شہید ہوئے ہیں، ان کے خون کے طفیل اس ملک میں امن کا سورج ضرور طلوع ہوگا۔ وطن پر جان نچھاور کرنے والے جوانوں کی شہادتیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ ان کے لہو سے فتح و نصرت کے پھول کھلیں گے اور پاکستان میں مستقل نوعیت کا امن قائم ہوگا۔

پسِ تحریر:

بے شمار واقعات رہ رہ کے یاد آتے ہیں۔ مخلص دوستوں کے بچھڑنے سے پیدا ہونے والی کمی کہاں کوئی پوری کرسکتا ہے؟ اور پھر دوست بھی بچپن کے ہوں تو پھر جدائی سے جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں منصور امریکہ رہ کر آیا تو واپسی پر میرے لئے تحفے میں روبوٹ لے کر آیا۔ اس روبوٹ کی شہرت ہمارے شہر میں یوں پھیلی کہ ہمارے ہم جماعت جواد اور فواد جو کہ جڑواں بھائی اور ہم شکل تھے اور ان کا ذکر محبت سے ''جادی فادی'' کے طور پر ہمیشہ مشترکہ ہی کیا جاتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کو منصور نے چاکلیٹ تحفے میں دی تھی۔ جادی فادی نے شدید احتجاج کیا۔ اس کی وجہ یہ کہ ان کا گھر منصور کے سامنے تھا اور بچپن بلکہ پیدائش سے اکٹھے تھے جبکہ میرا گھر قدرے فاصلے پر تھا۔ اس لئے ہمسائیگی کے بنیادی حقوق کے سبب روبوٹ پر ان کا بنیادی حق تھا، جو کہ منصور نے مجھے تحفے میں دے ڈالا تھا۔ جادی فادی کے احتجاج کی ابتدا اپنے گھر سے ہوئی کہ ان کے ساتھ شدید ناانصافی ہوئی ہے اور پھر اس احتجاج کی چنگاریاں منصور کے گھر تک بھی پہنچنے لگیں۔ اس کے والدین کو احتجاج ریکارڈ کروایا گیا کہ منصور نے ہمسائیگی کے بنیادی اصولوں سے انحراف کیا ہے اور عامر کو دیئے جانے والے روبوٹ کے صحیح اور جائز حقدار وہ تھے۔ یہ چھٹی، ساتویں جماعت کے دنوں کی بات ہے جب اس مسئلے پر جادی فادی نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ اسی حالت میں وہ ہمارے سکول میں انچارج ٹیچر ماسٹر سلیم صاحب 24 والے کے پاس پہنچے کہ انہیں انصاف دلایا جائے، کہاں امریکی روبوٹ اور کہاں معمولی چاکلیٹ جو کہ ان دونوں بھائیوں کے حصے میں آئی ہیں؟ سلیم صاحب 24 والے منصور

کے گھر کے سامنے اور جادی فادی کے گھر کے پہلو میں واقع بیٹھک میں ہمیں ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ یہ گھر بھی منصور کے خاندان کی ملکیت تھی۔ قصہ مختصر یہ صدائے احتجاج جادی فادی نے وہاں بھی بلند کی اور اس کی گونج وہاں سے ہمارے پورے شہر کو سنائی دی۔ آج کل دونوں بھائی نیو یارک میں مقیم ہیں، میں جب بھی امریکہ جاتا ہوں تو نیو یارک میں میرا قیام انہی کے گھر پر ہوتا ہے۔ منصور کی وفات پر ہم دوست ایک دوسرے کو پرسہ دیتے رہے۔ اور سبھی دوست اس تاریخی واقعے کو بھی یاد کرتے رہے۔ جس میں منصور نے مجھے روبوٹ اور جادی فادی کو چاکلیٹ دی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ بلیک چاکلیٹ مجھے منصور نے ہی کھلائی تھی۔ ہم اسٹیڈیم میں کھیل رہے تھے کہ اس نے مجھے چاکلیٹ تھما کر کہا کہ کھا کر بتاؤ کیسا ذائقہ ہے؟ میں نے چاکلیٹ منہ میں رکھی تو شدید کڑوی تھی، میں سمجھا شائد اس نے مذاق کیا ہے، لہٰذا میں نے فوراً تھوک دیا۔ اور منصور سے کہا کہ ایسا بے ہودہ مذاق نہیں کرنا چاہیئے۔ اس پر سنجیدگی اور متانت سے اس نے کہا کہ نہیں یار!! میں نے کوئی مذاق نہیں کیا اور میرے ہاتھ میں پکڑی باقی ماندہ چاکلیٹ مجھ سے لے کر کھانے لگا۔ اس پر مجھے شبہ ہوا کہ شاید یہ چیز کھانے کی ہی ہے مگر میرے ''ٹیسٹ بڈ'' اس ذائقے سے ابھی ناآشنا ہیں۔

ایک اک کر کے ستاروں کی طرح ڈوب گئے
ہائے کیا لوگ مرے حلقۂ احباب میں تھے

مشتاق احمد یوسفی کا عہد

مشتاق احمد یوسفی عہد ساز مزاح نگار تھے۔ان کی موت سے اردو ادب ایک ایسے لکھاری سے محروم ہوگیا ہے جسے فخریہ طور پر عالمی ادب کے کسی بھی مقابلے میں پاکستان کی نمائندگی کے لیے پیش کیا جا سکتا تھا۔ان کی پیدائش 1923 میں راجستھان کے شہر جے پور میں ہوئی تھی۔علی گڑھ سے انہوں تعلیم حاصل کی مگر پہلی تحریر پاکستان میں 1955 میں حنیف رامے کے رسالے''سویرا'' میں شائع ہوئی جس کا عنوان''صنف لاغر'' تھا۔قیامِ پاکستان کے بعد وہ ہجرت کر کے کراچی منتقل ہوگئے اور بقیہ زندگی اسی شہر میں گزاری جس کے موسم کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ اس فضا میں صرف تاجر اور مہاجر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ایک درجن کے قریب مزاحیہ مضامین جب سویرا کے علاوہ نصرت،افکار اور دیگر ترقی پسند رسالوں میں شائع ہو چکے تو چند نئے مضامین شامل کر کے''چراغ تلے'' کے عنوان سے 1961 میں کتابی شکل میں شائع کیے گئے۔اس کے بعد انہوں نے خاکم بدہن 1970 میں شائع کروائی تو ادبی دنیا میں اس کی اشاعت نے ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔زبان دانی کے وہ بادشاہ تھے۔ بنک کی نوکری بھی کرتے رہے جس کے تجربات کا نچوڑ''زرگزشت'' کی صورت میں سامنے آیا۔''آبِ گم'' اردو کی ہمیشہ باقی رہنے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ زندگی کی 97 بہاریں دیکھنے والے مشتاق احمد یوسفی کی آخری کتاب'' شامِ شعر یاراں'' تھی۔اس کتاب پر خاصی تنقید ہوئی کہ یہ یوسفی صاحب کے دیگر مجموعوں کی نسبت بجھی بجھی سی لگتی ہے۔مگر سچی بات تو یہ ہے کہ اس اعلیٰ معیار کی اردو زبان میں پچھلے دس سال میں مزاح

کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔آدم جی ایوارڈ سے لیکرانہوں نے بے شمارادبی ایوارڈاورقومی وعالمی اعزازات حاصل کیے۔اردومزاح نگاری میں انہوں نے نئے اور بلند معیارات قائم کیے ان کی خدمات کوکبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں دوباتوں کی وضاحت کرتا چلوں۔ایک تویوسفی صاحب کی عمر کے بارے ان کی سرکار ی دستاویزات کے مطابق سن پیدائش 1923 ہے جبکہ ان کا بیان تھا کہ دراصل 1921 یعنی کہ دو سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ دوسری وضاحت ان کے تخلیقی سفر کی ابتدا کے بارے میں ہے ۔اشاعت کے لیے اپنا پہلا مضمون انہوں نے ادبی ماہنامہ ادب لطیف کوارسال کیا تھا،مگر میگزین کے ایڈیٹرمرزاادیب نے اسے مسترد کردیا،ان کے نزدیک یہ شائع ہونے کے قابل نہیں تھا۔میں یہ واقعہ اس لیے درج کر رہا ہوں تا کہ نئے لکھنے والے اہل قلم کی حوصلہ فزائی ہوسکے۔ بقول ڈاکٹرفرمان فتح پوری ''ہم مزاح کے عہدِ یوسفی میں زندہ ہیں'' بالفاظ دیگر ہمارا عہد ادب میں مشتاق احمد یوسفی کے نام سے موسوم ہے۔نوجوان لکھاریوں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ عہد سازمزاح نگارکا پہلا مضمون مدیر نے غیر معیاری ہونے کے سبب نا قابل اشاعت قرار دیا تھامگر آج بدترین ناقد بھی یہ تسلیم کرنے پرمجبور ہیں کہ مشتاق احمد یوسفی ہمارے عہد کا سب سے بڑامزاح نگار ہے۔

زرگزشت کسی حدتک سوانح حیات بھی کہی جاسکتی ہے۔زندگی کا غالب حصہ یوسفی صاحب نے بنک ملازمت میں گزارا۔ بینکنگ کی دنیا کے معتبر ترین لوگوں کے ساتھ کام کیا۔بی سی سی آئی کے مالک آغاحسن عابدی سےتو ان کا دوستانہ تھا،اسی سلسلے میں ایک عشرہ لندن بھی گزارآئے۔ بنک کی دنیامیں وہ مشتاق احمد خان تھے،انتہائی پروفشنل بنک کار، یہاں تک کہ جوش ملیح آبادی نے اپنے خطوط میں ان کے عدم تعاون کا ذکر کیا ہے۔ادبی دنیا میں انہوں نے کبھی سماجی تعلقات بڑھانے کی کوشش نہیں کی ۔میری نظر میں وہ ایک تنہائی پسند شخص تھے۔محفل کے آدمی نہیں تھے۔ ہمارے خانیوال کے ادیب دوستوں نے ایک دفعہ انہیں مدعو کیا تو آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگے،مگر شرط یہ کہ سامعین چھ سات لوگوں سے زیادہ نہ ہوں۔اس صورت حال میں احباب نے فیصلہ کیا کہ ہم خود ہی کراچی ان کے گھر اتنے افراد چلے جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ایک ہزار کلومیٹر

سفر کرنے کی زحمت انہیں نہ دی جائے۔ایک دفعہ انٹرویو کے دوران مزاح نگاروں کی کمی کا تذکرہ کیا تو کہنے لگے"اچھا ہے،ڈنک مارنے والے جتنے کم ہوں اتنا اچھا ہے"۔

ان کی آخری کتاب کے بارے میں شنید ہے کی ان کے اہل خانہ نے بچی کھچی تحریروں کو یکجا کر کے شائع کروادیا۔اس کتاب میں شامل تحریریں مختلف انواع کی ہیں۔مختلف مواقع پر کی گئی تقریریں بھی اس کتاب میں شامل کردی گئی ہیں۔بھلے اس کتاب کے ناشر اور یوسفی صاحب کے بچوں کے مقاصد ادبی سے زیادہ معاشی نوعیت کے ہوں،مگر شام شعر یاراں میری نظر میں یہ ایک مثبت اقدام تھا۔بالخصوص قائداعظم پر لکھا گیا ان کا مضمون تو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی تحریروں میں شامل ہے۔قائداعظم محمد علی جناح جیتے، جاگتے،باتیں کرتے،عدالت میں دلائل دیتے ہم یوسفی کی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔شام شعر یاراں کی تحریریں گزشتہ چار کتابوں کے مقابلے میں گرچہ پھیکی پھیکی لگتی ہیں،مگر قائداعظم کے متعلق ان کا مضمون تو ان کی تمام کتابوں پر بھاری نظر آتا ہے۔امجد اسلام امجد بتاتے ہیں کہ بیوی کی وفات کے بعد مشتاق احمد یوسفی نے زمین پر سونا شروع کر دیا تھا۔کہتے تھے کہ اب زیادہ جدائی برداشت نہیں ہوتی۔شہرت سے ایسا بے نیاز شخص ادبی دنیا میں کم از کم میں نے تو کم کم ہی دیکھا ہے۔یہ اہم بات ہے کہ انہوں نے تمام عمر اپنی توجہ اپنی تخلیق پر ہی مرکوز رکھی۔شہرت اور سماجی روابط ان کی ترجیح نہیں رہے۔چند دوستوں کے نزدیک وہ مردم بیزار شخص تھے،مگر میرے خیال میں فنکار کو اس کے فن کے حوالے سے پرکھنا چاہئے نہ کہ اس کی شخصیت اور بشری رجحانات کی روشنی میں۔وہ ایک عام آدمی کی زندگی

گزارنا چاہتے تھے۔ایک عام آدمی کے مسائل اورغم ،خوشیاں ان کی تحریروں کا موضوع رہا۔اور ایک عام آدمی کی طرح وہ رخصت ہوئے۔سچ مگر یہ ہے کہ وہ بہت خاص آدمی تھے۔بہت بڑے آدمی ،باصلاحیت فنکار اور درددل رکھنے والے ہمدرد انسان ۔ان کی انسان دوستی ان کی تحریروں سے چھلکتی ہے۔اس قحط الرجال میں ان کی رخصتی کا غم اس لئے بھی زیادہ ہے کہ ان جیسا اور کوئی بھی نہیں ہے۔ان کا طرزتحریر جداگانہ اور موضوعات بے مثال تھے۔اپنی تحریروں میں تو ہمیشہ زندہ رہیں گے،مگر ہم تو ان کے عہد کے لوگ ہیں ۔ان کی ذات کی کمی بھی ہمیشہ محسوس کرتے رہیں گے۔اب ایسا کون بچا ہے جو قائداعظم، جواہرلال نہرواور گاندھی جی سے بالمشافہ ملا ہو۔مشتاق احمد یوسفی اس تاریخی عہد کے آخری آدمی تھے۔

پاش پاش ہو کے بکھرا ہوا وہ لہو

کراچی سے منتخب سابق رکن قومی اسمبلی اور نوجوان سیاستدان سید علی رضا عابدی کو کرسمس کے دن ان کے گھر کی دہلیز پر قتل کر دیا گیا۔ایک صاف ستھرے ،مہذب ،تعلیم یافتہ دلیر اور باصلاحیت سیاستدان کی شہادت سے پاکستانی سیاست میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مدتوں پورا نہیں ہوگا۔محبّ وطن اور درد مند دل رکھنے والے لوگ ان کی کمی ہمیشہ محسوس کرتے رہیں گے۔ان کے بہمانہ قتل سے امن کی خواہش اور امید رکھنے والوں کو شدید جذباتی دھچکا لگا ہے۔تمام اہم سیاسی جماعتوں کے سربراہان اور قائدین نے دہشت گردی کے اس ظالمانہ واقعے کی شدید مذمت کی ہے۔بلاول بھٹو زرداری تو صنم بھٹو کے ہمراہ علی رضا عابدی کے والدین سے تعزیت کرنے کے لئے خود ان کے گھر پہنچے۔کراچی پریس کلب کے باہر شہید سید علی رضا عابدی کی والدہ نے اظہارِ یکجہتی اور افسوس کرنے والوں،اس کی یاد میں شمعیں روشن کرنے والوں سے خطاب کیا۔اس خطاب میں انہوں نے جس جرات مندی اور دلیری سے اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار کیا،اور فیض و اقبال کی جو شاعری پڑھی ،اس نے تمام اہل دل کو رلا دیا۔اس باہمت خاتون کی آواز میں ہلکی سی بھی لرزش نہیں تھی۔جواں سال بیٹے کی موت کا دکھ تو لہجے میں ضرور تھا۔مگر چٹان جیسا حوصلہ اور بے خوفی بھی تھی۔جب وہ پڑھ رہی تھیں کہ:۔

نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تن داغ داغ لٹا دیا

کروکج جبیں پہ سرکفن میرے قاتلوں کوگماں نہ ہو
کہ غرورعشق کابانکپن پس مرگ ہم نے بھلادیا
جورکے توکوہِ گراں تھے ہم جوچلے توتوجاں سے گزر گئے
رہِ یارہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنادیا

بہت سے قارئین شائدنہیں جانتے ہوں گے کہ علی رضاعابدی کی والدہ محترمہ خودبھی صاحبِ دیوان شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔''زندان ذات'' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔میری ان سے خاص نسبت کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہمارے ضلع خانیوال سے تعلق رکھتی ہیں اور ہمارے دوست سید مصدق شاہ کی ہمشیرہ ہیں۔چندسال پہلے ان کے شعری مجموعے کی تقریب رونمائی خانیوال میں منعقدہوئی توصدارت کے لئے لاہور سے امجداسلام امجدخصوصی طور پرتشریف لائے،جبکہ مہمان خصوصی میرے بڑے بھائی راناباب رحسین تھے جوکہ ممبر پارلیمنٹ بھی ہیں۔صحافی وشاعردوست طاہرنسیم نے علی رضاعابدی کی والدہ امّ سارہ کاشعری مجموعہ مجھے عنائت فرمایااورتقریب رونمائی میں اظہارِخیال کرنے کی فرمائش بھی کی۔بلاشبہ میرے لئے یہ اعزاز کی بات تھی۔کتاب کے مطالعہ کے بعدجومیرے تاثرات وجذبات کتاب اورصاحب کتاب کے بارے میں تھے میراخیال ہے کہ ان کے اظہار سے آپ شہید کی حوصلہ منداور باہمت والدہ کے نظریات،سوچ وفکراورشخصیت سے تعارف حاصل کرسکیں گے۔ان کاذرایہ شعرملاحظہ فرمائیں

دار ہو کہ خنجر ہو یا کہ زہر کا پیالہ
ان گنت سزائیں ہیں جرم اک کہن تنہا

''زندان ذات'' کامطالعہ کرکے مجھے طمانیت کااحساس ہوا۔امّ سارہ کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ ہے اورانہیں بات کہنے کا سلیقہ بھی آتاہے۔ان کے ہاں اردوشاعری کی مثبت روایات کاپاس واحترام بھی موجودہے۔حمدونعت ومنقبت سے آغاز اورسلام بحضورامام عالی مقامؑ سے شعری مجموعے کے اختتام سے ام سارہ کی مذہب سے جذباتی وابستگی کاپتہ ملتاہے۔ان کی شاعری اردوادب کے قدیم وجدیدموضوعات کاحسین امتزاج ہے۔کہیں ہمیں اردوشاعری کی صنف سہراملتی ہے،جوکہ اب نایاب ہوتی جارہی ہے، تو دوسری طرف ''چشم دید'' جیسی

جدید نظمیں۔کیا خوبصورت شاعری ہے۔امّ سارہ کی ذرا غور فرمائیے

اُلجھے ہوئے ذہنوں سے نکل کر کبھی دیکھو
اس دھوپ کا کیا رنگ ہے جل کر کبھی دیکھو
ان لوگوں کی خاموش صدائیں ذرا سننا
صاحب ! تمہیں کیا کہتے ہیں نوکر کبھی دیکھو

درحقیقت جب کوئی اہلِ قلم اپنی شعری کاوشوں کے ساتھ سامنے آتا ہے تو اس کے کلام کا مطالعہ اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ ہم اسے بالکل اسی نگاہ سے دیکھیں۔جیسے ایک کھلتے ہوئے پھول کو دیکھتے ہیں،یعنی ہر نئے پھول کو اس کی پنکھڑیوں کی بناوٹ،اس کے رنگوں کی دل آویزی اور اس کی مہکار کے حوالے سے انتہائی غیر محسوس طور پر دوسرے بہت سے پھولوں سے جدا کر کے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔شعروسخن کی شاخوں پر بھی جب کوئی نئی آواز کھلتی ہے تو وقت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اسے آوازوں کے ہجوم سے جدا کر کے بغور سنا جائے ،کہ یہ ایک بامعنی اور باشعور آواز کے طور پر اپنے عہد سے جڑی ہوئی ہے،یا محض بڑھتے ہوئے شور کی لایعنیت کا ایک حصہ ہے۔ام سارہ کی شاعری اپنے معاشرے اور عہد و زمان سے باخبری کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

دوڑ ہے مشینوں کی جگمگاتے صحرا میں
اور اک طرف لیٹی خواہش وطن تنہا

اس کے پہلے شعری مجموعے ’’زندان ذات‘‘میں جن شعری امکانات کی موجودگی کے اشارے ملتے ہیں وہ اس بات کی نوید دیتے ہیں کہ وہ دیگر قلم کاروں کے قافلے میں بھرپور تیاری اور اعتماد کے ساتھ شامل ہو چکی ہیں۔اور یہ نظم تو لگتا ہے جیسے ام سارہ نے اپنے بیٹے سید علی رضا عابدی کے لئے اس کی شہادت پر ہی لکھی ہو،وہی سردی کا موسم اور وہی خون کی ارزانی۔

ان سبھوں کے بدن
گرم و زندہ بدن
برف کے یخ تھپیڑوں سے پھٹنے لگے

ان کے ہر عضو سے خون رسنے لگا
اس لہو کی حرارت بھری ایک بوند
برف کی یخ زمیں پر تڑپنے لگی
پاش پاش ہو کے بکھرا ہوا وہ لہو
اک شگاف اس زمیں میں بنا نہ سکا
چند لمحوں کی سردی میں گم ہو گیا

پسِ تحریر:

کئی سال گزرنے کے باوجود علی رضا عابدی کے قاتلوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

یہ خون خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

منیر نیازی کی بذلہ سنجی

دسمبر اپنی سرد ہواؤں سمیت اپنا جوبن دکھا رہا ہے۔ یہ اردو اور پنجابی کے عہد ساز شاعر منیر نیازی کی رخصتی کا مہینہ بھی ہے۔ پندرہ سال پہلے یہ دسمبر کا ہی ایک سرد دن تھا جب یہ باکمال شاعر ہم سے جدا ہو گئے۔ منیر نیازی شعروسخن کا ایسا جاوداں حوالہ ہے جس کے بغیر ادب اور ہمارے عہد کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ جیسی باکمال اور غیر روایتی ان کی شاعری تھی ویسی ہی بے مثال اور پرکشش ان کی شخصیت تھی۔ ان جیسی گفتگو سننے کو میری طرح ان تمام احباب کے کان ترس گئے ہوں گے جن کی نیازی صاحب سے آشنائی تھی۔ پورا سچ بولتے تھے اور نفع ونقصان سے بے نیاز ہو کر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے تھے۔ بقول شخصے بندہ ضائع کر دیتے تھے مگر جملہ ضائع نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی پر باآسانی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ایسے زندہ دل اور خوشگوار آدمی کی برسی کے موقع پر بھی جی نہیں مانتا کہ سوگوار گفتگو کی جائے۔

رسیا آدمی تھے۔ جب جب بھی میں نے ان سے مشاعرے میں شرکت کی درخواست کی تو انہوں نے اعزازیے کا کبھی نہیں پوچھا، البتہ ''ام الخبائث'' کا کیا بندوبست ہے؟ یہ سوال کبھی کبھی پوچھ لیتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز کو خصوصی طور پر ناپسند فرماتے تھے، جس کا سبب راقم کو معلوم نہیں ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی آدمی انہیں مشکل سے ہی پسند آتا تھا۔ ان کے حاسدین، جن کی کوئی کمی نہیں تھی، انہیں ''مردم بیزار'' قرار دیتے تھے مگر یہ بات تو سامنے کی ہے کہ شاعر ہونے کی صورت میں کسی بھی آدمی کی نیازی صاحب کی نظر میں پسندیدگی کے امکانات

انتہائی کم ہو جاتے تھے۔ہمارے عہد کے ایک نامور شاعر کے بارے میں ان کا فرمان تھا کہ ''ایسا نامراد ہے کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی لوگوں کا وقت ضائع کرتا ہے'' ایک نوآموز شاعر انہیں ایک دفعہ لاہور کے ایک چائنیز ریستوران میں لے گیا۔شاید ان سے اپنی کتاب کا فلیپ لکھوانا چاہتا تھا۔نیازی صاحب کے ہاں ایک ملاقاتی بھی اس وقت موجود تھا۔انہیں بھی مروتاً نیازی صاحب ساتھ لے گئے تھے۔کھانا کھایا جا چکا اور بل ادا کرنے کا وقت آیا تو میزبان شاعر نے اپنی جیبیں ٹٹولنے کے بعد اعلان کیا کہ اف! میں تو اپنا پرس ہی گھر بھول آیا ہوں۔منیر نیازی نے ملاقاتی ساتھی کی طرف دیکھا تو جواباً اس نے بھی معذرت بھری نگاہ سے مسکرا کر دیکھا۔جب نیازی صاحب کو یقین ہو گیا کہ اب چارونا چار کھانے کا بل انہیں ہی ادا کرنا ہے تو تو انہوں سے نوجوان شاعر کو مخاطب کر کے کہا کہ نانہجار! ایک تو تم شاعر انتہائی ماٹھے ہو اور اوپر سے اپنے ساتھ پرس بھی نہیں رکھتے ہو۔

اصل نام منیر احمد تھا مگر قلمی نام سے ہی شہرت دوام پائی۔مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کے قصبے خانپور میں ولادت 1928 کو ہوئی۔اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں پر ہی حاصل کی تھی۔ساہیوال کا ان دنوں منٹگمری نام ہوا کرتا تھا، پاکستان کے قیام سے بیشتر ہی یہاں منتقل ہو گئے تھے، میٹرک انہوں نے منٹگمری سے ہی کیا اور پھر انٹرمیڈیٹ کے لئے صادق ایجرٹن بہاولپور تشریف لے گئے۔ایک اور ہجرت کی تو لاہور آ گئے اور دیال سنگھ کالج سے BA پاس کیا۔ان کی شاعری میں ہجرت کا استعارہ شاید اسی وجہ سے نمایاں نظر آتا ہے۔سچ بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے سے بڑا شاعر کسی کو نا مانتے تھے اور معاصرین سے تو بالکل بھی متاثر نہیں ہوتے تھے۔پچھلی صدی کے کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر کے بڑے سے بڑے شعر پر ان کی زیادہ سے زیادہ داد، ٹھیک اے!! اچھا اے!! بس یہیں تک ہوا کرتی تھی۔ان کے ادبی نظریے کا خلاصہ پیش کیا جائے تو وہ یوں تھا کہ کائنات کی تاریخ میں آج تک ایک ہی شاعر عظیم ہوا ہے اور اس کا نام منیر نیازی ہے۔یہ بات ان کے منہ سے جچتی بھی تھی، چونکہ وہ تھے بھی فقید المثال، نابغہء روزگار۔انتہائی خوبصورت آدمی تھے۔باہر اور اندر سے اجلے اجلے۔ظاہر اور باطن بالکل ایک جیسا روشن۔بس ذرا غیر روایتی تھے۔لنڈے کی گفتگو نہیں کیا کرتے تھے۔جینوئن خیالات کا اظہار ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

معاصرانہ چشمک شاعروں میں ایک قابل قبول عمل سمجھا جاتا ہے اور قابل فہم بھی ہے کسی حد تک ۔ واقفان حال جانتے ہیں کہ لاہور کے ادبی منظرنامے پر ایک طویل عرصہ تک احمد ندیم قاسمی کا طوطی بولتا تھا۔ جس محفل میں بھی جائیں کرسئ صدارت ان کے لئے مختص رہتی ۔ ریڈیو پاکستان کے ایک مشاعرے میں منیر نیازی تشریف لائے اور سیدھے جا کر کرسئ صدارت پر بیٹھ گئے ۔ چہ مگوئیاں ہوئیں اور امجد اسلام امجد سے مدد مانگی گئی، کہ وہ اس بارے میں بات کریں۔ امجد صاحب نے جا کر منیر نیازی سے کہا کہ نیازی صاحب آپ جس کرسی پر براجمان ہیں وہ صاحبِ صدر کی ہے۔ اس پر نیازی صاحب نے پنجابی میں استفسار کیا کہ ''اوکون اے؟'' یعنی کہ صاحب صدر کون ہے؟ امجد صاحب نے جواب دیا کہ جناب احمد ندیم قاسمی ۔ اس پر نیازی صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا ''تے اوکون اے؟ یعنی کہ وہ کون ہے؟ گویا احمد ندیم قاسمی کو جانتے ہی نہ ہوں۔ قاسمی صاحب کے عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ تھا، جس میں راقم الحروف بھی شامل ہے، ایک پورے عہد نے ان سے کسبِ فیض کیا۔ مگر منیر نیازی کا اس بابت قول تھا کہ ''احمد ندیم قاسمی برگد کا وہ گھنا درخت ہے جس کے سائے میں خبیث روحیں پلتی ہیں'' کبھی کبھی ان کی دراز عمری پر چوٹ کرتے ہوئے انہیں ''سدا بہار بوڑھا'' کا خطاب بھی دیتے تھے۔ یہ تو خیر بڑے لوگوں کی آپس کی باتیں ہیں میری نظر میں تو دونوں حضرات ہی عظیم شعراء اور بہترین انسان تھے۔

منوّ بھائی نے مجھے بتایا کہ منیر نیازی نے کالم نگاری کی کوشش بھی کی تھی۔ ان دنوں ''امروز'' ایک مقبول روزنامہ ہوا کرتا تھا۔ دیگر شاعر دوستوں کی دیکھا دیکھی جو کالم نگار بھی تھے، نیازی صاحب نے بھی کالم نگاری شروع کر دی۔ پہلے دن کے کالم میں جتنے لطیفے یاد تھے لکھ ڈالے۔ باقی جو لطیفے یاد تھے اگلے دن کے کالم میں وہ بھی لکھ دیے۔ اب تیسرے کالم کا ایک پیرا گراف لکھنے کے بعد قلم آگے جا ہی نہیں رہا تھا۔ طویل سوچ بچار کے بعد انہوں نے رکشہ کروایا اور ریواز گارڈن میں واقع منوّ بھائی کے گھر یہ کالم لے کر پہنچ گئے۔ کہنے لگے یہ کالم مکمل کر دیں، آئندہ میں کبھی کالم نہیں لکھوں گا۔ ویسے وہ کالم نہ لکھنے کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ کالم نگار تین ، تین جگہ سے تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ منوّ بھائی سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ یہ بھی وجہ ہو سکتی تھی کہ دونوں کا نام منیر احمد تھا۔ ہم نام ہونے کے علاوہ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ میاں چنوں مشاعرے پر

بلایا تو رات دونوں ہمارے گھر کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے تھے۔احمد فرازؔ اور قاسمیؔ صاحب ایک کمرے میں تھے قیام پذیر تھے۔

مشاعرے سے پہلے مشروب مغرب کی بوتل ہاتھ میں پکڑے ایک ایک لفظ غور سے پڑھ رہے تھے اور منوّ بھائی کے علاوہ جاوید شاہیں کو سنا رہے تھے۔اس ہدایت کے ساتھ کہ ڈاکٹر نے سخت منع کیا ہے۔جاوید شاہیں کا کہنا تھا کہ کیوں خود کو ترسا رہے ہو؟ مشاعرے کے اختتام پر منوّ بھائی اور منیر نیازی کو میں نے اپنی گاڑی میں بٹھایا، رات کے پچھلے پہر دونوں میں بحث چل رہی تھی کہ لاہور واپسی کا سفر ابھی اختیار کیا جائے یا پھر رات میاں چنوں میں قیام کیا جائے۔منیر نیازی کا کہنا تھا ''منوّ بھائی تم نے ساری زندگی گھر کو گھر نہیں سمجھا'' حیرت انگیز طور پر منوّ بھائی کا یہ رویہ معذرت خواہانہ تھا کہ یار صبح اٹھ کر چلے جائیں گے، رات ادھر ہی سوتے ہیں۔میں نے مصالحت کروانے کی کوشش کی اور درمیان کا راستہ تجویز کیا کہ جناب آپ دو، تین گھنٹے سو لیں، اس کے بعد چلے جایئے گا۔اس پر نیازی صاحب بھنّا کر بولے کہ یار!! ہم کوئی فوجی تھوڑی ہیں جو دو گھنٹے سوئیں؟ گیسٹ روم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے میرے بڑے بھائی سے شکوہ کیا کہ آپ نے اتنا اچھا گھر بنایا ہے مگر سیڑھیاں ٹھیک نہیں ہیں۔نیازی صاحب کے اس جملے کے پیش نظر بھائیجان نے سیڑھیاں بعد ازاں نئی بنوا دیں مگر سیڑھیوں پر لڑکھڑانے کی وجہ کچھ اور تھی شاید۔

آخری عمر میں تخلیقی عمل رک سا گیا تھا۔کسی نقاد نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ منیر نیازی نے تو پچھلے سترہ سال میں ایک شعر بھی نہیں کہا، وہ کیسا شاعر ہے؟ اس کے جواب میں نیازی صاحب نے فرمایا کہ مرزا غالب نے تو پچھلے ڈیڑھ سو سال میں کوئی شعر نہیں کہا ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ آخری مرتبہ ان سے ملنے گیا تو ڈرائیور کا شکوہ کرنے لگے کہ بڑا ''تھن ٹٹ'' ہے۔میں نے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا تو سمجھانے لگے کہ جس بچھڑے کو بھینس کا دودھ وقت سے پہلے چھڑوا دیا جاتا ہے، اس کی شخصیت پر پر تشدد اثرات کا تفصیلی بیان کر کے ''تھن ٹٹ'' سمجھایا۔ایک چرب زبان شاعر کے تذکرے پر تبصرے کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ہے تو رکشہ مگر ہارن اس نے ٹرک کا لگوا رکھا ہے۔اسی متعلق پہلے کہہ چکے تھے کہ یہ ہیں تو کیچوے مگر انہوں

نے سانپوں کی وردیاں پہن رکھی ہیں، یہ بھی کہ اگر سانپ کا زہر نکل جائے تو کیچوا ہی رہ جاتا ہے مگر منیر نیازی نے مجھے بتایا کہ میرے متعلق زیادہ تر واقعات اور منسوب جملے لوگوں نے خود گھڑے ہیں۔ان کی بات سچ بھی مان لی جائے تو ان جیسا جملے باز اور بذلہ سنج کم از کم میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

؎خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

مظہر بخاری۔ شمع محفل تھا وہ شخص

مظہر بخاری شعروادب کا ایسا جاوداں حوالہ ہے جس کے بغیر ہمارے دبستان کی تاریخ نامکمل رہے گی۔خوبصورت لہجے کے میٹھے شاعر اور عمدہ نثر نگار،ان کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ابھی کل ہی کی تو بات ہے جب ہم سکول میں زیرِ تعلیم تھے اور شعروسخن سے چھیڑ خانی کیا کرتے۔ان دنوں پتہ چلا کہ ہمارے شہر میں مظہر بخاری نام کا ایک شاعر ہے۔جو کہ پورے پاکستان کے ادبی حلقوں میں جانا پہچانا جاتا ہے۔جب ملاقات ہوئی تو انہیں انتہائی مخلص اور حساس انسان پایا اوران کے بارے میں یہی تاثر تمام عمر قائم رہا۔دبلا، پتلا، دراز قد کا یہ مہذب نوجوان جو نئے لکھنے والوں اورادب میں نو واردان کی ہمیشہ دل جوئی کرتا ہے۔سکول کے دنوں میں ان سے قائم ہونے والا احترام،محبت اور دوستی کا یہ تعلق ہمیشہ قائم رہا۔ہم شاعر لوگ محبت اور وفا کے شعر کہتے ہیں،اپنی وفا وخلوص اور چاہت پر فخر کرتے اور جتاتے ہیں۔مگر جامہ تلاشی میں یہ وفا،خلوص اور محبت کی جنس ہم سے رتی برابر بھی اگر برآمد ہی نہ ہوسکے تو پھر ہمارا سارا تخلیقی عمل مشکوک ہے۔ہم جس وفا کی تبلیغ کرتے ہیں اور جس محبت کے پرچارک ہیں وہ ہماری شخصیت اور ذات کا بھی ضروری حصّہ ہونی چاہئیے۔مظہر بخاری ان اہلِ قلم میں سے تھے جو سراپا محبت تھے۔ان کے وجود سے تمام عمران اعلیٰ اقدار و حسنِ سلوک کا اظہار ہوتا رہا جس کا تذکرہ ان کی شاعری اور نثر میں ملتا ہے۔اتنی کم عمری میں ان کے داغ مفارقت دے جانے سے نا صرف ان کے اہلِ خانہ اور ہم دوست انتہائی مغموم ہیں،جو کہ قابل فہم اور فطری عمل ہے، بلکہ ہمارے ساتھ ساتھ پاکستان اور بیرون ملک پاکستانیوں کا وہ حصہ جو شعروسخن سے دلچسپی رکھتا ہے مظہر بخاری کی وفات پر رنجیدہ ہے۔میرے لئے چشم تصور میں وہ منظر لانا محال ہے کہ میاں چنوں میں کوئی ادبی تقریب ہو اور اسٹیج پر نظامت کے لئے

مظہر بخاری موجود نہ ہوں۔

ان جیسا ادب پرور میرے شہر کے لوگوں نے کم کم ہی دیکھا ہے۔تمام عمر شاعروں،ادیبوں کو جمع کر کے شہر میں ادبی و تخلیقی فضا قائم رکھنے کیلئے کوشاں رہے۔پاکستان کے لاتعداد شاعر اور ادیب ایسے ہیں جن سے مجھے بخاری صاحب نے متعارف کروایا۔اگر میں یاد کروں کہ میں نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ شعری محفلوں میں شرکت کون سی جگہ پر کی ہے تو بلاشبہ وہ مقام مظہر بخاری کی بیٹھک ہے۔

توں بیلی تے سب جگ بیلی،ان بیلی وی بیلی
تیرے باج محمد بخشا سنجی پئی حویلی

دوستوں کی خاطر مدارت میں ہمیشہ انہیں مستعد پایا۔بے پناہ سخی انسان تھے۔بہت بڑا دل اور درد دِل رکھتے تھے۔مظہر بخاری کی اچانک وفات سے پیدا ہونے والا خلا ہمیشہ محسوس کیا جائے گا۔فقط یہی نہیں کہ ان کے اہلِ خانہ اور دوستوں کے لئے یہ خلا کبھی پر نہیں ہوگا۔بلکہ ادبی،علمی حلقوں میں بھی ان کی کمی کو ہمیشہ محسوس کیا جائے گا۔ایسا ہمدرد انسان کہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر فوراً تڑپ اٹھتا،ایسا صاحب دل کہ دوسروں کے درد کو محسوس کرتا تھا۔ذاتی دکھ درد اور تکالیف کو ہمیشہ مسکرا کر اٹھانے والا اور سب سے ہمیشہ خنداں پیشانی اور خلوص سے پیش آنے والا۔مگر عدمؔ کے الفاظ میں اہل صدق وصفا میں یہی ایک خرابی ہے۔

عدمؔ خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بہت جلدباز ہوتے ہیں

مظہر بخاری کی رحلت میرے لئے ایک ذاتی نقصان اور صدمہ بھی ہے کہ میں ایک مخلص ذاتی دوست اور قابل اعتماد ساتھی سے محرم ہو گیا ہوں۔اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور جنت میں ان کا مقام اعلیٰ و بلند ہو کہ یہی ان کے لئے دعا دل سے نکلتی ہے۔بخاری صاحب! آپکی کمی ہم تمام عمر محسوس کرتے رہیں گے۔انا للہِ وانا علیہ راجعون

ان کی بے وقت وفات پر ہمارے دوست خالد شریف کا یہ شعر حرف بہ حرف صادق آتا ہے کہ

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

احمد ندیم قاسمی ۔ تجھ سا کہاں سے لائیں

احمد ندیم قاسمی فقط ایک فرد کا نام نہیں بلکہ اردو شعر و ادب اور صحافت کے ایک عہد کا نام ہے۔ وہ قلم قبیلے کا ایسا روشن حوالہ ہیں جس کی چکا چوند ان کی موت بھی کم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اہل قلم کا ایک قافلہ انہوں نے اپنی زندگی میں تیار کیا جس کے نا صرف وہ میرِ کارواں تھے بلکہ استاد اور سالار بھی تھے۔ ان کی شاگردی میرے لئے تو ہمیشہ باعثِ اعزاز اور ''قاسمی سکول آف تھاٹ'' سے تعلق افتخار کی بات رہی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی سالگرہ ان کے عقیدت مند ہمیشہ بڑی دھوم دھام اور اہتمام سے مناتے تھے۔ ہمارے ادبی میگزین ارژنگ کی پوری ٹیم کا شمار ان کے نیاز مندوں اور دائرہ شفقت میں ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے ان کی 84 ویں سالگرہ کا اہتمام ہماری ٹیم نے لاہور کے شیزان ہوٹل میں کیا تھا۔ اگر اس یادگار سالگرہ تقریب کا احوال لکھنے لگ جاؤں تو یہ الگ مضمون کا متقاضی ہوگا۔ اسی موقع کی مناسبت سے میں نے ان کا ایک انٹرویو بھی کیا تھا، جو بے حد مقبول ہوا۔ قاسمی صاحب مجھے یوں یاد آ گئے کہ اگر وہ حیات ہوتے تو آج کل ہم ان کی 105 ویں سالگرہ کا جشن منا رہے ہوتے۔ مجھے رفتگان کو یاد کرنے کے لئے برسی کی نسبت سالگرہ کا موقع زیادہ پسند ہے۔ وہ اس لئے بھی کہ عظیم لوگ تو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ بلھے شاہ کے الفاظ میں

بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور

ایسی شاندار، بامقصد، بامعنی زندگی گزارنے والے شخص کی حیات جاوداں چراغوں کے

ایک سلسلے کی طرح ہماری جہالت کے اندھیرے مٹاتی اور رہنمائی کرتی چلی جاتی ہے۔قاسمی صاحب کے چہرے پر ہمیشہ تبسم رہتا تھا۔ان کے لہجے کی نرمی سے ان کی سخت اصول پسندی اور نظریاتی وابستگی کی گہرائی کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

اگر کہا جائے کہ برصغیر پاک وہند میں روزنامہ امروز پہلا اردو اخبار تھا جسے عوامی مقبولیت اور قبولیت حاصل ہوئی تو یہ مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حق بیانی ہوگی۔احمد ندیم قاسمی نہ صرف اس کے ایڈیٹر رہے بلکہ اردو صحافت کی تاریخ میں جو معتبر مقام روزنامہ امروز کو حاصل ہے اس میں کلیدی کردار قاسمی صاحب کا ہی تھا۔صحافیوں کی ایک پوری نسل کی انہوں نے تربیت کی اور تادم مرگ جنگ اخبار میں باقاعدگی سے کالم لکھتے رہے۔امروزان کی ادارت کے دنوں میں ترقی پسند اور بائیں بازو کے نظریات کا حمایتی اخبار تصور کیا جاتا تھا۔جنرل ایوب خان نے جب مارشل لاء نافذ کیا تو اس کے کچھ ہی عرصے بعد قاسمی صاحب پابندِ سلاسل کر دیئے گئے۔ان کا اخبار قومیالیا گیا۔ایک شام ٹمپل روڈ لاہور میں ان کے اشاعتی ادارے ''اساطیر'' کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی گرفتاری کی روداد بیان کی تھی۔بتاتے تھے کہ لباس اور جوتے تبدیل کرنے کی اجازت بھی سرکاری حکام نے بمشکل عطا فرمائی تھی۔آزادی صحافت اور جمہوریت کی بالادستی کے لئے بارہا انہیں جیل جانا پڑا۔نظریاتی آدمی تھے لہٰذا ماتھے پر کبھی شکن نہیں لے کر آئے۔حریت فکر کا راستہ انہوں نے خود ہی اپنے لئے منتخب کیا تھا۔مجبوری نہ تھی۔

محبت کرنے والے آدمی تھے یوں کہہ لیجئے کہ سراپا محبت تھے۔ہمارے ایک ہم عصر شاعران کے دفتر میں بیٹھے ایک دن قاسمی صاحب کو اپنی بدگوئی اور جھوٹے پروپیگنڈے کی صفائی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ محبت کا یقین بھی دلانا چاہتے تھے۔مذکورہ شاعر چونکہ ایک ادبی چیتھڑے کے ایڈیٹر بھی تھے جس میں قاسمی صاحب کے بارے میں بدزبانی اور بے سروپا الزام تراشی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔میں نے جب یہ منظر دیکھا تو اس بات پر حیران تھا کہ قاسمی صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ مصنوعی نہ تھی بلکہ محبت سے لبریز تھی۔معاصر شاعر کو کہنے لگے کہ ''محبت ایسا جذبہ ہے کہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی ،اس کا پتہ چل جاتا ہے ،خود بخود'' بتاتے تھے کہ اپنے ادبی سفر کا آغاز انہوں نے شاعری سے کیا تھا۔بعدازاں افسانہ نگاری اور کالم نویسی کی جانب راغب

ہوئے۔اقبال ،ظفر علی خاں اور اختر شیرانی کی شاعری انہیں زیادہ پسند تھی۔جبکہ افسانے کے معاملے میں وہ منشی پریم چند کے عاشق تھے۔فیض احمد فیض کے ساتھ ان کا انگریزی کی ترکیب کے مطابق ''لو ہیٹ''،یعنی محبت اور نفرت کا ملغوبہ نما تعلق تھا۔یہ تعلق تھا مگر بہت گہرا۔دونوں ہم عصر بائیں بازو کے شاعر ،ایک ہی اخباری گروپ کے ایڈیٹر،یاد رہے کہ فیض صاحب انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کے انہی دنوں ایڈیٹر تھے جن دنوں قاسمی صاحب امروز کے مدیر تھے۔ترقی پسند تحریک سے وابستہ ان دونوں نابغہ روزگار شخصیات کی باہمی خط وکتابت بھی رہی جو کہ اب کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے اور خاصے کی چیز ہے۔گرچہ دونوں کے درمیان معاصرانہ چشمک بھی پائی جاتی تھی۔

ایک دن میں نے قاسمی صاحب سے فیض احمد فیض کا ذکر چھیڑ دیا۔ان کے چند شعر سنائے ،چونکہ آدھا ''نسخہ ہائے وفا'' تو مجھے زبانی یاد تب بھی تھا،اپنے اور فیض صاحب کے باہمی تضادات کا ذکر کرنے لگے۔چین کے دورے کا تذکرہ چھیڑ دیا،کہنے لگے کہ فیض اور میں ایک جھیل کی سیر کے موقع پر ایک کشتی میں سوار تھے۔فیض صاحب رسیا آدمی تھے۔دیگر موجود احباب بھی ان کے ساتھ مہ نوشی میں مشغول تھے۔ان کے دل میں نا جانے کیا آئی کہ ایک جام شراب کا بھر کر مجھے بڑی لجاجت سے پیش کرنے لگے۔میں نے انکار کیا۔اصرار بڑھتا گیا تو میں نے جام تھام لیا۔کچھ توقف کے بعد میں نے اس جام کو جھیل کے پانی میں انڈیل دیا۔یہ دیکھ کر فیض صاحب کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔کہنے لگے تم نے شراب کی توہین کی ہے،اب میں کبھی تمہیں شراب پیش نہیں کروں گا۔قاسمی صاحب صاف ستھرے آدمی تھے۔زندگی میں کبھی شراب نوشی نہیں کی۔ان کا کہنا تھا کہ میں ترقی پسند تھا اور ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک سیدھا سادہ مسلمان بھی ہوں۔میں نے انہیں کبھی میلے لباس میں نہیں دیکھا،روزانہ شیو بناتے تھے،نوے سال کی طویل عمر پائی مگر عمر کے آخری برسوں میں بھی ذہنی اور جسمانی طور پر ہمیشہ انہیں مستعد پایا۔منیر نیازی انہیں ''سدا بہار بوڑھا'' کہتے تھے۔منیر نیازی صاحب کی باتوں کا کیا برا ماننا،''بڑے آدمی تھے''خیر یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں کہ مجھے انٹرویو دیتے ہوئے قاسمی صاحب نے بھی منیر نیازی کے بارے میں کہا تھا کہ وہ صرف سطح کی شاعری کرتے ہیں،انہیں تو گہرائی میں جانے سے باقاعدہ خوف آتا

ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے آپ کو نقاد بھی بہت ملیں گے۔جس کی وجہ میری نظر میں تو واحد یہ ہے کہ ان کی سماج میں عزت اور اثر ورسوخ چونکہ بہت زیادہ تھا، اس لئے بہت سارے لوگ ان کو ہدفِ تنقید بنا کر لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ذاتی طور پر ان کا ماننا تھا کہ میری مخالفت کا آغاز اس وقت ہوا جب رسالہ ''فنون'' جاری ہوا۔یاد رہے کہ قاسمی صاحب نے نصف صدی سے زائد عرصے تک اردو زبان وادب کے اس سب سے معتبر و مؤقر رسالے کی ادارت کا فریضہ بھی انجام دیا۔آج کل ان کی دختر نیک اختر ان کا یہ ادبی مشن جاری رکھے ہوئے ہے۔

احمد ندیم قاسمی جیسا نفیس اور شائستہ آدمی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔غیرت منداور ہمدرد، شفیق مگر اصول پرست، روشن خیال مگر بلند کردار۔اپنی زندگی کی آخری دو دہائیاں ہم نے انہیں لاہور کے مال روڈ پر مجلس ترقی ادب کے دفتر میں صدر نشین کی کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ضعیفی کے باوجود ایک عجیب وقار، رعب اور طنطنہ تھا ان کی شخصیت کے اندر کرسی پر ڈھیلے، ڈھالے نہیں بیٹھتے تھے۔بلکہ الرٹ اور تیر کی طرح سیدھی کمر کے ساتھ۔ انتہائی غریب پرور انسان تھے۔دوسروں کے کام آنے والے۔ایک محنت کش اور غیرت مند ماں کی اولاد تھے جو کہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی، انا اور غیرت کے ساتھ مفلسی کے مشکل دن بچوں کے ساتھ کاٹنے والی اس عورت کی ساری خوبیاں ان کے بیٹے میں بھی نظر آتی تھیں، دنیا جسے آج احمد ندیم قاسمی کے نام سے جانتی ہے۔پاکستان کے تمام اہم سرکاری اعزازات اور تمغے انہیں ملے لیکن میں نے قصداً ان کا ذکر نہیں کیا۔چونکہ اقربا پروری اور سیاسی وابستگیوں کی بنیاد پر اعزازات کی لوٹ سیل نے ان کی قدرو قیمت کو ڈالر کے مقابلے میں پاکستانی روپے کی قیمت سے بھی کم کر دیا ہے۔کسی بھی تخلیق کار کے لئے سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ عام لوگ اسے کیسے یاد رکھتے ہیں؟ اس بے بدل شاعر اور اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار کا اصل اعزاز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔اہلِ محبت دعاؤں میں اسے یاد کرتے ہیں۔انہی کے ایک شعر کے ساتھ خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

احمد ندیم قاسمی کی مغفرت کے لئے میری نظر میں تو ان کی ایک نعت، بلکہ نعت کا ایک شعر ہی کافی ہوگا انشاءاللہ

پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرمؐ
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیراؐ

شیشوں کا مسیحا رخصت ہوا

گرونانک سے منسوب ہے کہ ان کے دوارہ میں ایک نیا نوجوان داخل ہوا۔ پرانے چیلوں نے محسوس کیا کہ گرونانک اس نئے آنے والے شخص سے خصوصی شفقت کررہے ہیں۔ اسے اپنے قریب بٹھاتے ہیں۔ اس کے کھانے پینے کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ جب باقی چیلے لنگر کے لئے بھکشا مانگنے جاتے ہیں تو گرو اس نوجوان کو ساتھ نہیں بھیجتے ہیں۔ ایک دن پرانے چیلوں نے باہمی مشاورت کی کہ آج گرو سے اصرار کریں گے کہ بھکشا مانگنے کے لئے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے والے اس نئے نوجوان کو بھی ہمارے ساتھ بھیجیں۔ معاملہ جب گرونانک کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے بغیر ہچکچاہٹ کے نئے نوجوان کو چیلوں کے ہمراہ بھیج دیا۔

اس موقع پر چیلوں نے باہمی مشورہ کیا کہ نئے چیلے کو ذرا مشکل چیلنج دیتے ہیں۔ آشرم کے قریب ہی ایک محل تھا، اس عظیم الشان محل کے دروازے نانک کے بھگتوں کے لئے کبھی بھی نہیں کھلتے تھے، اور نہ ہی کبھی کوئی خیرات وہاں سے ملی تھی۔ نئے نوجوان کو یہ ٹاسک دیا گیا کہ وہ محل کے دروازے پر بھکشا کے لئے آواز لگائے، بغیر چوں چراں کے نئے چیلے نے محل کے دروازے پر خیرات کے لئے صدا دے دی محل کی ایک کھڑکی سے وہاں کی مکین شہزادی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ چیلے یہ نظارہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ محل کا دروازہ کھلتا ہے اور وہی شہزادی ایک طشتری لاتی ہے۔ جس میں سجے سونے، چاندی اور جواہرات اس نوجوان کے دامن میں ڈھیر کردیتی ہے۔ اس پر چیلے آپس میں گفتگو کرتے ہیں کہ ہمارے لئے تو یہ دروازہ کبھی کھلتا ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ

خالی ہاتھ ہی یہاں سے لوٹے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے چیلے کا دامن سیم وزر اور قیمتی موتیوں سے بھر دیا ہے؟ خیر انہوں نے اس بات پر طمانیت کا اظہار کیا کہ ہمارا سال بھر کا راشن، لنگر تو اس خیرات سے چل جائے گا۔ گرونانک کے دوارہ پہنچے تو باقی چیلے زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ دیگر احباب کا کہنا تھا کہ ہم تو درویش لوگ ہیں، ہم نے سونے چاندی اور جواہرات کا کیا کرنا ہے؟ انہیں کھایا تو نہیں جاسکتا ہے، ہمیں تو کھانے کے لئے کچھ چاہئے۔ بہتر ہوگا کہ اس نوجوان کو یہ مال وزر دے کر واپس محل بھیج دیا جائے اور ان سے اپیل کی جائے کہ ہمیں کھانے کے لئے کوئی دال دلیا عنائیت کیا جائے۔

گرونانک باطنی آنکھ رکھتے تھے۔ انہوں نے بحث میں الجھے بغیر مذکورہ نوجوان کو دیگر چیلوں کے ہمراہ واپس اسی محل بھیجا، کہ قیمتی اشیاء کولوٹایا جائے، اور کھانے کے لئے ہی کچھ مانگ کر لائیں۔ نوجوان چیلا جب اس محل کے دروازے پر پہنچا تو شہزادی نے پھر اس کا استقبال کیا، کھانے کی فرمائش سن کر فوراً ہی دیگیں پکانے کا حکم دیا۔ طرح طرح کے پکوان اپنی نگرانی میں تیار کروا کر شہزادی کھانے کے ہمراہ خود گرونانک کے حضور پہنچ گئی۔ نانک معاملہ کو سمجھ چکے تھے۔ شہزادی سے پوچھنے لگے کہ کیا چاہتی ہو؟ کیا مانگنے آئی ہو؟ شہزادی نے بلا جھجک اس نوجوان چیلے کی طرف اشارہ کیا کہ یہ چاہیے۔ جس کو گرو کی خصوصی توجہ حاصل تھی۔ گرونانک نے شہزادی کو انکار نہیں کیا مگر یہ ضرور کہا کہ میرے ان سب چیلوں میں سے کام کا بھی بس یہی ایک تھا، جس کی تم نے فرمائیش کی ہے۔

دراصل وہ نوجوان چیلا ایک راجواڑے کا شہزادہ تھا۔ سب کچھ تیاگ کے اس نے سنیاس لے لیا تھا۔ گرونانک کے دروازے پر وہ روشنی کی تلاش میں اور ابدی نجات کی امید پر پہنچا تھا۔ شہزادی نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس شہزادی نے تو گرونانک سے اجازت مانگی تھی کہ وہ شہزادے کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہے، مگر موت کی شہزادی تو کسی سے اجازت طلب نہیں کرتی ہے۔ اس بار ہمارے شہزادے شاعر دوست فرتاش سید کو لے گئی۔ ادب کا دیار اور گہوارہ ویران ہو گیا۔ اجل ایسا پھول توڑ کر لے گئی کہ سارا گلشن سخن ہی ویرانی کا منظر پیش کر رہا ہے۔

نوجوان شاعر، ماہرِ تعلیم، ادیب و دانشور ڈاکٹر فرتاش سید کی کرونا کے باعث ہلاکت سے جو

خلا پیدا ہوا ہے، وہ کبھی بھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ کھلکھلاتا چہرہ، زندگی سے بھرپور قہقہے اور یاروں کا یار شخص۔ روایت ہے کہ جب خالق کائنات نے مختلف فرشتوں کو مخصوص فرائض تفویض کئے، عزرائیل کو موت کا فرشتہ مقرر کر دیا گیا۔ صوفی بزرگ بتاتے ہیں کہ عزرائیل نے اس پر مالک حقیقی سے استفسار کیا، کہ اے اللہ اگر میں لوگوں کی جان قبض کروں گا، تو اس طرح ساری دنیا ہی میرے خلاف ہو جائے گی؟ بے نیاز نے فرمایا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوگا، لوگ مختلف بہانوں کو دوش دیں گے۔ اس بار ہم کرونا کو دوشی اور ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں۔ احباب کا کہنا ہے، کہ وہاڑی ڈسٹرکٹ ہسپتال میں اگر وینٹی لیٹر دستیاب ہوتا، تو ہمارا یہ ہر دلعزیز دوست شائد اب بھی زندہ ہوتا۔

عامر بن علی کا ادبی سفر

محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)

گزشتہ دس برسوں میں نوجوان شعراء کی جو نسل ابھر کر سامنے آئی ہے۔اس میں سے ایک اہم نام عامر بن علی کا ہے۔اس کی شاعری نوجوان نسل کے ساتھ ساتھ ثقہ اور معتبر ادبی حوالوں سے بھی لائق توجہ اور پسندیدہ ہے۔ (امجد اسلام امجد)

ادب سے عامر بن علی کی کمٹمنٹ ہے اور یہی کمٹمنٹ اسے کچھ کر گزرنے کے عمل پر اکساتی رہتی ہے اور بے چین رکھتی ہے۔ نفرت اور منافقت سے آلودہ موجودہ ادبی فضامیں ایسے شاعروں کا وجود غنیمت ہے جو نہ صرف شاعری میں محبت اور پیار کی بات کرتے ہیں بلکہ خود اسکی عملی تصویر بھی ہیں۔ (عطاء الحق قاسمی)

چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)

عامر بن علی کی غزلوں میں بھی ان کی ذہانت اور حساسیت جگہ جگہ نمایاں ہے مگر ان کا حقیقی تخلیقی جوہر ان کی نظموں میں اظہار پاتا ہے۔وہ جدید نسل کے نمائندہ شاعر ہیں اور ان کے کلام میں امکانات کے آفاق خاصے وسیع ہیں۔ (احمد ندیم قاسمی)

عامر بن علی کومل، معصوم اور سچّے جذبوں کو سادگی اور سلاست کے ساتھ شعری پیکر عطا کرنے کے خوابیدہ عمل میں سرشار ہیں۔ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی لطافت اور نغمگی ہے جو قاری یا

سامع کے دل ودماغ پر پھوار کی طرح برستی ہے۔ پھر دھیمے دھیمے انداز میں سلگاتی چلی جاتی ہے۔

(اسلم کولسری)

سرگوشیاں (شعری مجموعہ)

عامر کی نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ "سرگوشیاں" اپنے عنوان کی طرح سبک، مدھم اور نرم ونازک جذبات وخیالات سے مزین ہے۔ان نظموں سے ہمیں اپنے آپ کو تلاش کرنے والی نوجوان نسل کو تلاش کرنے اور اسے سمجھنے اور پیار کرنے کی دعوت ملتی ہے۔

(منّو بھائی)

عامر بن علی زندگی کے غبار آلود راستے پر ہمہ وقت سفر کرنے والا ایک نوجوان ہے۔انتھک، باعمل اور اچھے برے موسموں میں سر اٹھا کر چلنے والا نوجوان ۔اس نے اس سفر میں آنے والے ہر چھوٹے بڑے مشاہدے اور تجربے کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب رہا ہے۔ (احمد عقیل روبؔی)

آج کا جاپان (سفرنامہ)

آپ کے سامنے مضامین کا ایک مجموعہ ہے جو سفرنامہ نہیں، تحقیقی مقالہ بھی نہیں بلکہ ''آج کا جاپان'' ایک تجربہ نامہ ہے۔مصنف نے جاپانی معاشرے کو اس کے اندر رہتے ہوئے خوب دیکھا، اپنا تجربہ خوب آزمایا۔پھر ایک طویل عرصہ تک اردو صحافت سے وابستہ رہنے سے تحریروں کو عمدہ لکھنے کا تجربہ بھی انہیں بہت خوب ہے۔اس لیے یہ تجربہ نامہ دوسرے سفرناموں سے منفرد ہے۔

(پروفیسر سو یامانے)

اس کتاب کی پاکستانی معاشرے کو بہت ضرورت ہے۔شاید اس کے مطالعے سے چند افراد کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہمیں بھی اپنے ملک اور قوم کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے جاپان سے کچھ سیکھنا ہے۔اس کتاب میں سفرنامہ اور قیام نامہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کیا گیا ہے اور رواں، سلیس، ہلکی پھلکی نثر میں بہت کام کی باتیں تحریر کی گئی ہیں۔

(خواجہ محمد زکریا)

گفتگو (انٹرویوز)

عامر بن علی اور ابرار ندیم کی انٹرویوز پر مشتمل کتاب میں آپ کو گہرائی اور گیرائی نظر آئے گی۔اس کی نظیر ان کے ہم عصروں میں بہت کم کم نظر آتی ہے۔

(عطاء الحق قاسمی)

گفتگو ایک اہم ادبی دستاویز ہے جو ادب کے قارئین کے لئے حوالے کی چیز ثابت ہوگی۔

(ڈاکٹر سلیم اختر)

محبت کے دو رنگ۔۔۔گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (تراجم)

عامر بن علی نے ایک طرف پابلو نرودا جیسے عظیم مزاحمت کار کی منتخب شاعری کا ترجمہ پیش کر دیا ہے وہاں نرودا کے سیاسی اور ادبی مسلک کے مدمقابل عالمی شہرت یافتہ گبریلا مسترال کے تراجم بھی پیش کر دیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ شعر و ادب میں دونوں غالب مگر مدمقابل رنگوں کو محبت کے ساتھ محسوس کیا جائے، یہ پہل عامر بن علی نے کی ہے اور نام رکھا ''محبت کے دو رنگ''

(ڈاکٹر انوار احمد)

یادنہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)

یہ شعری مجموعہ نئی نظموں کا نمونہ ہے۔اس کی نظم جدید نظم کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو کہ ن۔م راشداور میراجی سے علیحدہ رجحان کا پتہ دے رہی ہیں۔بعض اوقات چونکا بھی دے رہی ہے۔

(شہرت بخاری)

روبرو (انٹرویو)

روبروعہد حاضر کے ناموردانشوروں اور صحافتی شخصیات کے انٹرویوپر مشتمل ہے ۔مختلف ادبی اور علمی شخصیات سے گفتگو میں ادب کے کئی نئے گوشے سامنے آئے ہیں۔ادبی مسائل کے علاوہ کئی شخصیات کی ذاتی زندگی بھی پڑھنے کوملتی ہے۔یہ انٹرویوز عامر بن علی،حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر نے کئے ہیں۔جن سے ان کے ذہن کے دریچوں میں جھانک کرانکے خوبصورت خیالات واحساسات جاننے کا موقع ملتاہے۔ان انٹرویوز میں مختلف کےلوگ شامل ہیں۔شاعر،ادیب اور صحافی۔لہٰذا یکسانیت کا ماحول نہیں ہے۔بلکہ ایک رنگا رنگی ہے۔اپنے اپنے میدان کے شہ سواروں نے اپنی کامیابی اورسفرکی دلچسپ داستانیں بیان کی ہیں۔

(روزنامہ جنگ)

Selected Poems of Amir Bin Ali

Amir Bin Ali is one of the finest poets from the younger Generation that Have emerged during the last Decade.

(Express Tribune Book Review)

Amir Bin Ali has Reinvigorated the Urdu poetry. He has always been a globetrotter filled with passion for travelling. Wandering all around the globe in search of New Sights and Experiences. He has written four poetry books and two Travelogues.along with his books of interviews with Celebrities. He has translated several Nobel Prize laureates poets, as he is expert in Seven International Language.

(Daily Times Book Review)

Amir Bin Ali is one of the finest poets from the Younger Generation that Have Emerged During the Last Decade
(Express Tribune Book Review)

Amir Bin Ali has Reinvigorated the Urdu poetry. He has always been a globetrotter filled with the passion for travelling. Wandering all around the globe in Search Of New Sights & Experiences. He has Written four poetry Books & Two Travelogues along with his Books Of Interviews With Celebrities. He has translated several Nobel Prize laureates poets, as he is Expert in Seven international Languages
(Daily Times Book Review)

عامر بن علی کا قلمی سفر

- محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)
- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)
- محبت کے دو رنگ ۔ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہِ راست اُردو میں کیے گئے تراجم)
- گفتگو (انٹرویوز)
- مکتوبِ جاپان (زیرِ طبع)
- آج کا جاپان (سفرنامہ)
- محبت کے موسم (شعری مجموعہ)
- گردِ سفر (کالمز)
- روبرو (انٹرویوز)
- Избранные стихотворения Амир Бин Али **Selected Poems of Amir Bin Ali**
- جہاں گردی (سفرنامہ)
- نگر نگر اک نظر (سفرنامہ)
- مدیرِ اعلیٰ: ماہنامہ ارژنگ لاہور

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

نستعلیق Publications